کوکھ جلی
راجندر سنگھ بیدی

کوکھ جلی

راجندر سنگھ بیدی

فہرست

لمس

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بات ہجوم کے بہت سے آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ان کے سامنے رسی کے حلقے ہیں۔ پتھر کے ایک بڑے سے چبوترے پر ایک مجسمہ بڑی سی چادر میں لپٹا ہوا تھا، جسے وہ بار بار دیکھتے، دیکھ دیکھ کر آنکھیں جھپکتے، بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے جمائیاں لیتے، اور پھر دیکھ کر اپنی اپنی بساط کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتے۔

ٹھنڈی سڑک روزمرہ کی طرح دھوپ میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایک جگہ دو رویہ

پیپل، شیشم، کروٹن چیل اور املتاس کے درخت سڑک پر جھکے ہوئے تھے اور ان کے خزاں زدہ پتوں میں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر سڑک کے سرمئی سیاہ رنگ کو جذامی بنا رہی تھیں۔ آج صبح ہی سے کول تار و ریت اور پتھر علاحدہ علاحدہ ہو کر ناچنے لگے تھے۔ نقاب کشائی کی رسم دیکھنے کے لیے ایک اچھا خاصا ہجوم اکٹھا ہو گیا، جس کا ایک حصہ زیادہ حرکت میں آ گیا تھا۔ فضا میں ہو ہو ہو کا ایک تکدر پیدا ہوا، جس میں ایک مبہم سی ہیبت بھی شامل تھی اور ایک صوتی تغزل بھی۔ پھر پیپل، کلیپ، کلیپ، کلیپ، کلیپ، لاتعداد تالیاں ایک ساتھ بجا رہے تھے اور سڑک کا واحد شیشم اپنی سینکڑوں سیٹیوں کے ساتھ مجمع سے ہم نوا ہو رہا تھا۔ ہجوم کے وسط میں سے 'سانپ آیا، سانپ آیا' کی آواز سے آتش بازی کا سا ایک انار چھوٹا اور بظاہر شیرازہ بکھر گیا، لیکن دائیں بائیں سے 'ہاتھی آیا' کے لایعنی نعروں سے پھر لوگ جمع ہو گئے۔

چبوترے کے سنگ خارا پر کچھ سنہری الفاظ کندہ تھے۔

سر جیوارام

۱۸۶۲ سے لے کر ۱۹۳۱ تک

ایک بڑا سخی اور آدم دوست

ہجوم اور الفاظ ایک دوسرے کو مسلسل گھور رہے تھے۔ ''گپت دان کیا کرتے تھے ہمیشہ۔'' سیوا سمتی کا ایک رضاکار اپنے سرخ سکارف کی گرہ کو ڈھیلا کرتے ہوئے بولا۔ ''بُڈھے نالے کے پار جو ودھوا آشرم ہے نا، اس کی دری اٹھائی گئی اور اس کے نیچے بیواؤں کی مدد کے لیے پانچ سو کے نوٹ ملے۔''

''چہ۔۔۔ تو کیا ہوا؟'' ہجوم میں سے ایک طرّے باز ٹوانہ بولا۔

''بات یہ تھی کہ سخاوت بے طریقہ تھی۔'' اور کسی بابو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں عورتوں کی ٹریفیکنگ زیادہ ہوئی اور کیا حاصل ہوا؟''

''لیکن جناب'' کوئی بولا۔ ''آپ کو ان کی نیّت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ یہ تو منتظمین کی حرام زدگی ہو گی۔'' اور ایک گیانی جی اپنی چنبل سے بھری ہوئی گردن کو کھجاتے ہوئے بولے، ''گیتا میں صاف لکھا ہے کہ دانی کو اپنے دان کا پھل پراپت کرنے کے لیے پھر جنم دھارن کرنا ہوتا ہے۔''

ہجوم کا شور نسبتاً بلند ہو گیا۔ یونیورسٹی ہال اور اس کے وسیع برآمدے میں طلبا

جیومیٹری کے پرچے دے رہے تھے۔ مثلث میں دو خطوں کی مجموعی لمبائی تیسرے خط کی لمبائی سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک طالب علم نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ وہ تمام کاغذ پھاڑ کر سیاہی انڈیل کر سامنے رقصاں و خنداں، لرزاں و حیراں ہجوم میں شامل ہو جائے۔ بڑے زور سے چیخے اور کہے ہمیں اس جومیٹری کا فائدہ ہی کیا۔ شور مچاؤ اے اہل وطن۔۔۔ اور فقط شور۔۔۔ اور کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ نے زور زور سے کچھ ہاتھ گھنٹی پر مارے، لیکن گھنٹی کی آواز بھی شور میں حل ہو کر رہ گئی۔ وہ بوکھلا کر اٹھے اور خود باہر آ کر مجمع سے مخاطب ہوئے۔ جناب آپ لوگوں کو اس بات کا خیال ہونا چاہیے۔۔۔

دبلے پتلے بے بضاعت سپرنٹنڈنٹ کی بقیہ آواز ایک لامتناہی غلغلے میں گم ہو کر رہ گئی۔ قہ قہ قہ۔۔۔ لوگ ہنسنے لگے۔ اس بات کا خیال ہونا چاہیے، خیال لیے پھرتا ہے۔ جا بیٹھ اپنی ماں کے پاس، ورنہ ڈھونڈتی پھرے گی اپنی عینک۔ اپنی ریڑھ کی ہڈی۔۔۔ جا جا۔۔۔ اس کے بعد کاروں کی پوں پوں، فٹنوں اور رئیسی ٹانگوں کی ٹن ٹن سے فضا اور بھی پر شور ہو گئی۔ ایک سارجنٹ کہیں سے نمودار ہوا۔ اس نے لبوں پر زبان پھیری۔ ہیٹ کو اونچا کیا اور اپنا بیٹن تان کر ہجوم میں یوں

گھومنے لگا، جیسے کوئی تیز سی چھری خربوزے میں پھر جائے۔ ''کاروں کو ادھر پارک کرو۔ اے یو انڈین، دائیں طرف۔'' سپاہی بولا۔ ''آپ کا نمبر کیا ہے۔'' پی پی ۵۶۲، اور لائسنس'' یہ لائسنس دیکھنے کا وقت ہے۔

''ہو ہو ہو۔''

''راجہ صاحب ہیں کہاں؟''

''ارے میاں کھینچ دو بت کی رسی کو خود ہی۔ آخر اس تکلف میں کیا دھرا ہے؟''

''ہونا دیسی وقت۔۔۔''

''چہ!۔۔۔ ایک۔۔۔ بڑا۔۔۔ آدم دوست!''

کچھ دیہاتی بھائی پھیرو اور اس کے نواح سے شہر کا کوئی میلہ یا عجائب گھر دیکھنے چلے آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کے لمبے لمبے لٹھ تھے، جن کے سروں پر لکڑی کے ''چوہے'' بندھے ہوئے تھے۔ ان کی دموں سے گاؤں میں باٹی ہوئی سَن کی رسیاں لٹک رہی تھیں، جنہیں وہ کھینچتے اور کھڑپ کھڑپ کا بے ہنگم، بے معنی، بے تال ساز بجاتے اور گاتے۔۔۔ ''کھٹن گیا تے کھٹ لیاندا اجھانواں۔۔''

”راستہ چھوڑ دو۔ راستہ چھوڑ دو۔“ ہجوم آپ سے آپ چھٹنے لگا، اور ایک کشمیری پنڈت زار و نحیف، قیصر ولیم کی سی ڈاڑھی چھوڑے، دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے گلے کا سنہری سروپا، اس کے گھٹنوں کو پھانس رہا تھا۔ بار بار وہ جھک کر سروپا کو گھٹنے سے علاحدہ کرتا، مبادا یہ عزّت و افتخار کا نشان اسے سرنگوں کر دے۔

یہ راجہ صاحب تھے جن کے ہاتھوں بُت کی نقاب کشائی ہونا تھی۔ زندگی کے ہر تجربے نے ایک لکیر ان کے چہرے پر ڈال دی تھی۔ کہیں کہیں خطوط کے مخمصے پڑے ہوئے تھے، جن میں نیلی نیلی وریدیں الجھتی سلجھتی ہوئی ایک بڑی سی گانٹھ کی صورت میں کنپٹی کے قریب نمایاں ہو گئی تھیں۔ ”جب یہ راجہ، یہ نقاب کشا مرے گا تو اس کا بت بہت حسین بنے گا۔“ کسی نے سنگ تراش کے نقطۂ نگاہ سے جانچا۔ آج کسی کی نقاب کشائی کرتا ہے، کل کوئی اس کی نقاب کشائی کرے گا۔ گویا راجہ مہندر ناتھ کوئی بہت بڑا جرم کر رہا ہے۔ کسی کی بہو بیٹی کی طرف دیکھتا ہے۔ ہجوم ہمیشہ ہمیشہ ہجوم ہی رہتا ہے۔ اس وقت دیہاتی اپنے بے ہنگم گیت کا دوسرا مصرعہ گا رہے تھے۔ کھٹن گیا تے کھٹ لے لیاندا جھاواں، نے جاندی

واری دس نہ گیا میں چٹھیاں۔۔۔ کدھر نو پاواں۔۔۔ اور بدستور چو ہوں کی کھٹ کھٹ سے ہجوم کی بے ربط آوازوں میں چند اور کا اضافہ ہو رہا تھا۔

سیوا سمتی والوں نے لٹھوں کو تانے ہوئے ہجوم کے ایک بڑے سے ریلے کو روک دیا۔ راجہ صاحب نے اپنے منہ میں ثعلب مصری کا ایک ٹکڑا اور الائچی ڈالی اور گلے کو ''اوہوں، اوہوں'' کی متعدد آوازوں سے صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''حضرات! انیسویں صدی میں ایک معجزہ ہوا اور وہ سر جیو ارام کی پیدائش تھی۔ لوگ معجزے کے متعلق سوچنے لگے۔ عام آدمیوں کی طرح جیوارام بھی پیدا ہو گیا۔ ہاہاہا۔۔۔ کیا روح القدس آیا تھا؟ کچھ آدمیوں کے گالوں پر فی الواقع آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کے دل میں سخاوت اور آدم دوستی کا جذبہ اس قدر بلند ہو چکا تھا، کہ وہ مال اور دولت اور بیوی تک سخاوت میں دے دینے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

سیوا سمتی کے ایک کارکن نے دو دفعہ نقاب کی رسی راجہ کے ہاتھوں میں دی اور وہ دونوں دفعہ پھسل گئی، جس کا مطلب تھا کہ راجہ کا جلد ہی مجسمہ بن جائے گا۔ آخر راجہ نے ایک جھٹکا دیا اور مجسمہ بے نقاب ہو گیا۔

لوگوں نے تالیاں بجائیں، پھول پھینکے۔ آخر یہ بات تھی! پھر وہ سوچنے لگے۔ وہ ناحق دو گھنٹے کھڑے رہے۔ لیکن مجسمہ خوبصورت تھا۔ مرمریں، بالکل روئی کا ایک بڑا سا گالا دکھائی دیتا تھا۔ سنگ مرمر کو کسی اطالوی نے اس قدر صفائی سے تراشا تھا کہ فرغل کی ایک ایک شکن واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ مونچھوں کے بل صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ مونچھیں، بت اپنی زندگی میں لب لگا کر باٹا کرتا تھا اور پھر ہاتھ کی رگیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ہاتھ ابھی حرکت میں آ جائے گا، ایسے ہی جیسے نقاب کشا کا ہاتھ بت بن جائے گا۔ بت اور نقاب کشا میں کوئی رازداری تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے کوئی خاص ہی ہمدردی تھی۔

شور اور بھی بلند ہو گیا۔ ہال کا ممتحن منہ پر جھاگ لانے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے عینک کو سنبھالا، دوسرا ہاتھ ریڑھ کی ہڈی پر رکھا اور حلقے کے تھانے کو ٹیلیفون کرنے کے لیے ایک چھوٹے ممتحن کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

املتاس کے درخت تموں کی پتلیاں نچا نچا کر ہنسنے لگے۔ کروٹن چیل سڑک کی سانوری صورت کو چومنے کی خواہش میں سائیں سائیں کرتا ہوا جھک گیا۔

اس وقت سورج کے سامنے ایک بہت بڑا بادل آجانے سے سڑک کا جذام دور ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی گدگدی کی طرح ایک خوشگوار پھوار سی پڑنے لگی۔ بت کے رشتہ دار ''نیم بت'' دیوتاؤں کی اس خوشنودی کے اظہار پر بہت خوش ہوئے۔ آخر خدا کو بھی ان کے باپ یا دادا کی سخاوت اور آدم دوستی پسند تھی۔

نقاب کشائی کے بعد بھی ہجوم کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ لوگ ابھی تک آنکھیں جھپک رہے تھے۔ کیا بس یہی معاملہ تھا؟ کیا وہ صرف اسی بات کے لیے دو گھنٹہ کھڑے رہے تھے؟ مجسمہ برف کی طرح سفید ہے، برف کی طرح منجمد! لیکن آخر بات کیا ہوئی؟

''۱۸۶۲ سے لے کر ۱۹۳۱ تک۔ اونہہ! کیا پتا وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہو۔''

''اس کا مطلب ہوا نا کہ اڑسٹھ سال۔''

''نا۔ نا۔۔۔ انہتر۔۔۔ سن باسٹھ تیری ماں کے پاس چلا گیا؟''

''اُلّو کا پٹھا۔۔۔''

''تم۔۔۔''

”تم۔۔۔“

”تیرا باپ۔۔۔“

اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا، ایک تیز فلم کی طرح کچھ مناظر آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ایک دو پگڑیاں زمین پر پڑی تھی۔ یا کبھی کبھار کوئی کرسی ہوا میں اچھلتی اور املتاس کی پتیوں کو چھوتی ہوئی نیچے آرہتی۔ لڑائی ہوئی اور رک گئی۔ اور پھر سب حیرت سے مجسمے کی طرف دیکھنے لگے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

ایک ٹٹ پونجیا اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا آگے بڑھا اور آنکھ کے تھیلوں کو دبا کر مجسمے کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی تک سیوا سمتی کے لوگ اپنے ڈنڈے لیے کھڑے تھے، حالانکہ ان کا مقصد ادا ہو چکا تھا۔ کھینچا تانی میں یا تو ان کے سکارف بالکل کھل گئے تھے اور یا گلے کا پھندا بن گئے تھے۔ دائیں جیب کا چڑے کے بادشاہ، ایسا ڈھکنا پھٹ رہا تھا جس میں سے چھاتی کا دایاں نپل، جس پر بے تحاشا بال اگ رہے تھے، دکھائی دینے لگا۔ سیناپتی کے منہ میں ایک لمبی سی وسل تھی۔ دھکم پیل میں اوندھے منہ گرنے سے وسل اس کے حلق میں چلی گئی تھی اور

دانتوں کو ناقابل علاج ضعف پہنچ گیا تھا۔ آج سیناپتی کو پہلی دفعہ سیوا کا میوہ پراپت ہوا تھا۔ وہ خوش تھا اگرچہ رو رہا تھا۔

ایک افیمی نے اپنی ڈبیہ نکالی۔ ہتھیلی میں رکھ کر گولی کو ملا اور کمیٹی کے نلکے سے پانی کا ایک گھونٹ پی کر اسے نگل گیا۔ پانی کے قطرے ابھی تک اس کی بے قابو ڈاڑھی میں بہہ رہے تھے۔ پانی پی کر وہ مجسمے کے قریب آیا اور اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا۔ اوئے بنتاں سیاں! اوکیہہ لکھیا ہئی؟ (ارے بنتا سنگھ! یہ کیا لکھا ہے؟) بنتا سنگھ نے جواب دیا، لکھا ہے۔ "ایک بڑا سخی اور آدم دوست"۔۔۔ اونہہ! بڑا سخی۔۔۔ افیمی بولا۔

دراصل کسی کو سر جیوارام کی سخاوت پر یقین نہ آتا تھا۔ ہجوم کے ذہن لاشُعور میں کوئی بات تھی۔ ان کی روح کی گہرائیوں میں کوئی ایسا جذبہ تھا جس کے تحت وہ کہہ رہے تھے۔ کوئی سخاوت نہیں۔ کوئی آدم دوستی نہیں۔ سب جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ ہے۔

مجسمے کی حقیقت کی نسبت انہیں سیوا سمتی والوں سے زیادہ نفرت تھی، جو کہ ابھی تک ڈٹ کر کھڑے تھے۔ افیمی، دیہاتی بابو، طالب علم سب کا خیال تھا کہ سمتی

والے ازل تک یہاں نہیں ملیں گے۔ وہ چاہتے تھے، یہ لوگ اِک دم وہاں سے چلے جائیں۔ ان کی موجودگی ہجوم میں ایک خاص قسم کا جذبۂ تنفّر اور بغاوت پیدا کر رہی تھی۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی کو مار ڈالیں، کچھ توڑیں پھوڑیں، سڑک پر سے گزرتی ہوئی عورتوں کی عصمت دری کریں اور نہیں تو طفل خورد سال کی طرح منھ ہی چڑادیں۔ وہ منھ چڑانے سے ڈرتے نہ تھے، اگرچہ ان کے چھدرے چھدرے دانتوں پر سے اینمل اڑ چکا تھا اور وہ مکمل طور پر سیاہ پڑ گئے تھے۔ بے احتیاطی اور گوشت خوری نے ان کے دانتوں کو جبڑوں تک کھوکھلا کر دیا تھا اور وہ جبڑوں سے تقریباً علاحدہ ہو چکے تھے۔ لوگ بنا جانے بوجھے ان مکروہ دانتوں کا مظاہرہ کر کے خوش ہو رہے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے دانت جتنے بدنما ہوں گے، اتنی ہی سیوا سمتی والوں کی تذلیل ہو گی۔

ان میں پتلے لوگ تھے اور موٹے بھی۔ لیکن ان کے جسم گٹھے ہوئے تھے اور تنومند۔ انہیں خود اپنی طاقت کا احساس نہ تھا۔ اور وہ ہمیشہ اس احساس کو جگا دینے والے کی تلاش میں رہتے تھے۔ وہ سمتی والوں کے پاس کھڑے رہے۔ اور سمتی والے بھی گویا چڑ سے گئے تھے۔ تماشائیوں کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آتی

تھی کہ سمتی والے اب نقاب کشائی کے بعد بھلا کیوں کھڑے ہیں؟ ایسے ہی جیسے اپنے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

موٹریں، فٹنیں اور تانگے سب جا چکے تھے۔ کہیں کہیں بابو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے دفتروں کو جا رہے تھے۔ بیشتر دس بجے پہنچ چکے تھے اور کچھ دیر بعد بیکار کھڑے لوگوں نے وہاں کھڑے رہنے کی نسبت گھر اور کام پر چلے جانا مناسب سمجھا۔ وہ کچھ دور گئے، لیکن انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی کوئی چیز مجسمے کے قریب بھول آئے ہوں۔ اس کے بعد ان کے پاؤں خود بخود واپس اٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے تئیں مجسمے کے سامنے پایا۔

مجسمہ بالکل سورج کی کرنوں میں الجھے ہوئے بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن۔۔۔ اونہہ! بیواؤں کو دان دیا ہو گا، عورتیں نکالی ہوں گی پٹھے نے۔ ابھی تک اس قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورتوں کی ٹھیکیداری بڑی نفع بخش چیز ہے۔ اور سیوا سمتی والے بدستور اپنے لٹھ لیے کھڑے تھے۔

اسی اثنا میں اپنے گلے کو خون سے صاف کرتے ہوئے سیوا سمتی کا سیناپتی آ گیا اور چبوترے کے پاس پہنچ کر اپنی کھدر کی نکر کو عریانی کی حد تک اونچا کرنے لگا۔ پھر اس نے رضاکاروں کو ایکا ایکی قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا اور قطار میں کھڑے ہونے کے بعد وہ حکم کے مطابق چلنے لگے۔

لوگ خوش تھے۔ انہوں نے رضاکاروں کے پیچھے تالیاں بجائیں یہ بہتر تذلیل تھی۔ بدنما دانت اور جبڑے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سیناپتی نے خشم آلود نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ گلے کو سہلایا اور چل دیا۔ لوگوں نے پتھروں کی طرح کے وزنی قہقہے پھینک کر رضاکاروں کو زخمی کر دیا۔ سیوا کا پھل میوہ۔۔۔

سب جانتے تھے کہ مجسمہ سنگ مرمر کا ہے، سفید ہے، سخت ہے، لیکن اتنی بات سے ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سات آٹھ قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوتے، ایک نظر مجسمے کو دیکھتے، پھر سب کے سب اس تک پہنچ کر اسے اپنے ہاتھوں سے چھو دیتے۔

"میں انگریجی نہیں جانتا" ایک دیہاتی نے کہا۔

سر جیوارام کا بت ہے جو ۱۸۶۲ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۱ میں مر گیا۔ وہ ایک بڑا سخی اور آدم دوست شخص تھا، اور انیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ۔۔۔

اب ہجوم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایک دفعہ پھر اپنے ہاتھوں کی پہنچ تک بت کو محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد بت کے پاؤں سیاہ ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد سب اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔

کوکھ جلی

گھمنڈی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھمنڈی کی ماں اس وقت صرف اپنے بیٹے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ پہلے پہر کی نیند کے چوک جانے سے اب اسے سردیوں کی پہاڑ ایسی رات جاگ کر کاٹنا پڑے گی۔ چھت کے نیچے لاتعداد سرکنڈے گننے کے علاوہ ٹڈیوں کی اداس اور پریشان کرنے والی آوازوں کو سننا ہو گا۔ دروازے پر زور زور کی دستک کے باوجود وہ کچھ دیر کھاٹ پر بیٹھی رہی، اس لیے نہیں کہ وہ سردی میں گھمنڈی کو باہر کھڑا کر

کے اس کے گھر میں دیر سے آنے کی عادت کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی ہے، بلکہ اس لیے کہ گھمنڈی اب آہی تو گیا ہے۔

یوں بھی بوڑھی ہونے کی وجہ سے اس پر ایک قسم کا خوشگوار آلکس، ایک میٹھی سی بے حسی چھائی رہتی تھی۔ وہ سونے اور جاگنے کے درمیان معلّق رہتی۔ کچھ دیر بعد ماں خاموشی سے اٹھی۔ چارپائی پر پھر سے اوندھی لیٹ کر اس نے اپنے پاؤں چارپائی سے دوسری طرف لٹکائے اور گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شمعدان کے قریب پہنچ کر اس نے بتّی کو اونچا کیا۔ پھر واپس آکر کھاٹ کے سانگھے میں چھُپائی ہوئی ہلاس کی ڈبیا نکالی اور اطمینان سے دو چٹکیاں اپنے نتھنوں میں رکھ کر دو گہرے سانس لیے اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن تیسری دستک پر یوں معلوم ہوا جیسے کواڑ ٹوٹ کر زمین پر آرہیں گے۔

”ارے تھم جا۔ اجڑ گئے۔“ ماں نے برہم ہو کر کہا، ”مجھے انتظار دکھاتا ہے اور آپ ایک پل بھی تو نہیں ٹھہر سکتا۔“

کواڑ کے باہر گھمنڈی کے کانوں پر لپٹے ہوئے مفلر کو چیرتے ہوئے ماں کے یہ الفاظ گھمنڈی کے کانوں میں پہنچے۔ ”اجڑ گئے۔“ ماں کی یہ گالی گھمنڈی کو بہت

پسند تھی۔ ماں اپنے بیٹے کے بیاہ کا تذکرہ کرتی اور بیٹا بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کرتا، جب بھی وہ یہی گالی دیتی تھی۔ ایک پل میں گھر کو بسا دینے اور اُجاڑ دینے کا ماں کو خاص ملکہ تھا۔

اس طور پر اتاؤلے ہونے کا گھمنڈی کو خود بھی افسوس ہوا۔ اس نے مفلر سے اپنے کان اچھی طرح ڈھانپ لیے، اور جیب سے چرائے ہوئے میکروپولو کا ٹکڑا سلگا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید 'آگ' سے قریب ہونے کا احساس اسے بے پناہ سردی سے بچا لے۔ پھر وہ میکروپولو کو ہوا میں گھما کر کنڈل بنانے لگا۔ یہ گھمنڈی کا محبوب مشغلہ تھا جس سے اس کی ماں اسے 'اوگن' بتا کر منع کیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت کنڈل سے نہ صرف تسکین ملحوظ خاطر تھی، بلکہ ماں کے ان پیارے الفاظ کے خلاف ایک چھوٹی سی غیر محسوس بغاوت بھی۔

سگریٹ کا آوارہ جگنو ہوا میں گھومتا رہا۔ گھمنڈی اب ایک اور دستک دینا چاہتا تھا لیکن اسے خود ہی اپنی احمقانہ حرکت پر ہنسی آگئی۔ وہ لوگ بھی کتنے احمق ہوتے ہیں، اس نے کہا، جو ہر مناسب اور نامناسب جگہ اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب انہیں کسی جگہ پہنچنا ہوتا ہے تو وقت کی ساری کسر سائیکل کے تیز

چلانے، یا بھاگ بھاگ کر جان ہلکان کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ اور یہ سوچتے ہوئے گھمنڈی نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور دروازہ کے ایک طرف نالی کے قریب دبک گیا۔

دھوبیوں کی کٹڑی میں اگا ہوا گوندی کا درخت پچھوا کے سامنے جھک گیا تھا۔ جھکاؤ کی طرف، ٹہنیوں میں چاند کی ہلکی سی پھانک الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ماں نے ضرور آج گلے میں دوپٹہ ڈال کر دوپٹے کی پھوئیں یکم کے چاند کی طرف پھینکے ہوں گے۔ اس کے بعد ایکا ایکی سائیں سائیں کی بھیانک سی آواز بلند ہوئی۔ ہوا، چاند کی پھانک اور گوندنی کا درخت مل جل کر اسے ڈرانے والے ہی تھے، کہ ماں نے دروازہ کھول دیا۔

"ماں۔ ہی ہی۔" گھمنڈی نے کہا اور خود دروازہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے ایک لمحہ پہلے وہ اپنے دانتوں کو بھینچ رہا تھا۔

"آجاؤ۔" ماں نے کچھ رکھائی سے کہا۔ اور پھر بولی، "آجاؤ اب ڈرتے کیوں ہو۔ تمھارا کیا خیال تھا، مجھے پتہ نہیں چلے گا؟"

گھمنڈی کو ایک معمولی بات کا خیال آیا کہ ماں کے منھ میں ایک بھی دانت نہیں ہے، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا پتہ نہیں چلے گا؟"

"ہوں۔" ماں نے دیے کی بے بضاعت روشنی میں سر ہلاتے اور چڑاتے ہوئے کہا، "کس کا پتہ نہیں چلے گا۔"

گھمنڈی کو پتہ چل گیا کہ ماں سے کسی بات کا چھُپانا عبث ہے۔ ماں۔ جو چوبیس سال ایک شرابی کی بیوی رہی ہے۔ گھمنڈی کا باپ جب بھی دروازے پر دستک دیا کرتا، ماں فوراً جان لیتی کہ آج اس کے مرد نے پی رکھی ہے۔ بلکہ دستک سے اسے پینے کی مقدار کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ پھر گھمنڈی کا باپ بھی اسی طرح دبکے ہوئے داخل ہوتا۔ اسی طرح پچھوا کے شور کو شرمندہ کرتے ہوئے۔ اور یہی کوشش کرتا کہ چپکے سے سو جائے اور اس کی عورت کو پتہ نہ چلے۔ لیکن شراب کے متعلق گھمنڈی کے ماں باپ میں ایک ان لکھا اور ان کہا سمجھوتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ جاتے تھے۔ پینے کے بعد گھمنڈی کا باپ ایک بھی وافر لفظ منھ سے نہ نکالتا اور اس کی ماں اپنے مرد کو پینے

کے متعلق کچھ بھی نہ جتاتی۔ وہ چپکے سے کھانا نکال کر اس کے سرہانے رکھ دیتی اور سونے سے پہلے معمول کے خلاف پانی کا ایک بڑا کٹورا چارپائی کے نیچے رکھ کر ڈھانپ دیتی۔ صبح ہوتے ہی اپنے پلّو سے ایک آدھ سِکّہ کھول کر گھمنڈی کی طرف پھینک دیتی اور کہتی،

"لے۔ اَدھ بلویا لے آ!"

اور گھمنڈی اپنے باپ کے لیے شکر ڈلوا کر اَدھ بلویا دہی لے آتا، جسے پی کر وہ خوش ہوتا، روتا، توبہ کرتا اور پھر "ہاتھ سے جنّت نہ گئی" کو جھٹلاتا۔ گھمنڈی نے ماں کے منھ سے یہ بات سنی اور خفّت کی ہنسی ہنس کر بولا، "ماں! ماں! تو کِتنی اچھی ہے۔" پھر گھمنڈی کو ایک چکّر آیا۔ شراب پچھوا کے جھونکوں سے اور بھی پُر اثر ہو گئی تھی۔ سگریٹ کا جگنو جو اپنی فاسفورس کھو چکا تھا، دور پھینک دیا گیا اور ماں کا دامن پکڑتے ہوئے گھمنڈی بولا، "اور لوگوں کی ماں ان کی بیوی ہوتی ہے، لیکن تو میری ماں ہی ماں ہے۔"

اور دونوں مل کر اس احمقانہ فقرے پر ہنسنے لگے۔ دراصل اس چھوکرے کے ذہن میں بیوی کا نقشہ مختلف تھا۔ گھمنڈی سمجھتا تھا، بیوی وہ عورت ہوتی ہے جو

شراب پی کر گھر آئے ہوئے خاوند کی جوتوں سے تواضع کرتی ہے۔ کم از کم رولنگ ملز کے مستری کی بیوی، جس کے تحت گھمنڈی شاگرد تھا، اپنے شرابی شوہر سے ایسا ہی سلوک کیا کرتی تھی اور اس قسم کے جوتی پیزار کے قصّے آئے دن سننے میں آتے ہیں۔ پھر کوئی ماں بھی اپنے بیٹے کو اس قسم کی حرکت کرتے دیکھ کر اچھّا سلوک نہیں کرتی تھی۔ بخلاف ان کے گھمنڈی کی ماں، ماں تھی۔ ایک وسیع و عریض دل کے مترادف، جس کے دل کی پہنائیوں میں سب گناہ چھپ جاتے تھے۔ اور اگر گھمنڈی کے اس بظاہر احمقانہ فقرے کی اندرونی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی متناقص شکل میں گھمنڈی کی ماں اپنے شوہر کی بھی ماں تھی۔

بستر پر دھم سے بیٹھتے ہوئے گھمنڈی نے اپنے ربڑ کے جوتے اتارے۔ یہ جوتے سردیوں میں برف اور گرمیوں میں انگارہ ہو جاتے تھے۔ لیکن ان جوتوں کو پہنے ہوئے کون کہہ سکتا تھا کہ گھمنڈی ننگے پاؤں گھوم رہا ہے۔ گھمنڈی نے ہمیشہ کی طرح جوتے اتار کر گرم کرنے کے لیے چولھے پر رکھ دیے۔ ماں پھر چِلّائی،

"ہے، مرے تیری ماں بھگوان کرے سے۔ ہے۔ گور بھوگ لے تُو کو۔"

لیکن ہندو دھرم بھرشٹ ہوتا رہتا۔ ماں جوتے اتار کر دور کونے میں پھینک دیتی۔ پھر بکتی جھکتی اپنے دامن میں ایک چونی باندھ گھمنڈی کے سرہانے پانی کا ایک بڑا سا کٹورا رکھ، متعفن بستر کی آنتوں میں جا دبکتی۔

حد ہو گئی۔ ماں نے دو تین مرتبہ سوچا۔ گھمنڈی نے بنواری اور رسید کی سنگت چھوڑ دی ہے۔ اس نے گھمنڈی کو شراب پینے سے منع بھی نہیں کیا اور نہ اپنے اوباش سنگی سنگاتی کے ساتھ گھومنے سے۔ ماں نے سوچا شاید یہ نرمی کے برتاؤ کا اثر ہے۔ لیکن وہ ڈر گئی اور جلد جلد ہلاس کی چٹکیاں اپنے نتھنوں میں رکھنے لگی۔ اپنے آپ کو مارنے کا اس کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا۔ ہلاس سے اپنے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دینا۔ لیکن اب ہلاس کا کوئی بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی نرمی سے ماں نے اپنے شوہر کا منھ بھی بند کر دیا تھا۔ اس کی شخصیت کو کُچل دیا تھا اور وہ بے چارہ کبھی اپنی عورت کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسی طرح گھمنڈی بھی اپنی ماں کے ساتھ ہم کلام ہونے سے گھبراتا تھا۔ ماں نے اس بات کو محسوس کیا اور پھر وہی۔ ''تیری ماں مرے بھگوان کرے سے۔'' لیکن اس بات کا اسے کوئی حل نہ سوجھ سکا۔

آج پھر چھ بجے شام گھمنڈی کارخانے سے لوٹ آیا، حالانکہ وہ نتھو اچوکیدار کی آواز کے ساتھ محلّے میں داخل ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی پُرانی تصویر دیکھنے چلا جاتا۔ وادیا کی مس نادیا کے گیت گاتا اور ایک دو سال سے اس کے پُراسرار طریقے سے غائب ہو جانے کے متعلق سوچتا۔ آج پھر اتنی جلدی لوٹ آنے سے ماں کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے۔ اس نے بیکار ایک کام پیدا کرتے ہوئے کہا،

"لے تو بیٹا۔ زیرہ لے آ تھوڑا۔"

"زیرہ؟" گھمنڈی نے پوچھا، "دہی کے لیے ماں؟"

"اور تو کیا تمھارے سر پہ ڈالوں گی۔" ماں نے لاڈ سے کہا اور ضرورت سے وافر پیسے دیتی ہوئی بولی، "لو یہ پیسے، ٹھیٹر دیکھنا۔"

"میں سینما نہیں جاؤں گا ماں۔" گھمنڈی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہی سیر تماشہ تو ہم لوگوں کو خراب کرتا ہے۔"

ماں حیران ہو کر اپنے بیٹے کا منھ تکنے لگی۔ "ابھی خیر سے ہاتھ پاؤں بھی نہیں کھلے۔ اتنی دانس کی باتیں کرنے سے نجر لگ جائے گی رے۔" اور دراصل وہ

اپنے بیٹے کو ایک شرابی دیکھنا چاہتی تھی۔ نہیں شرابی نہیں، شرابی سے کچھ کم، جس سے تباہ حال نہ ہو جائے کوئی۔ لیکن یہ بھل منسیت بھی ماں کو راس نہ آتی تھی۔ اس نے کئی عقل مند بچے دیکھے تھے جو اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ عقل مندی کی باتیں کرتے تھے، اور انہیں ایشور نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

گھمنڈی زیرہ لانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پیسے لے کر دروازے تک پہنچا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے دروازہ کے باہر جھانکا۔ ایک قدم باہر رکھا، پھر پیچھے کی جانب کھینچ لیا اور بولا، "باہر چچی کھڑی ہے اور منسی بھی ہے۔"

"تو پھر کا؟" ماں نے تیوریوں کا ترشول بناتے ہوئے کہا۔

"پھر کچھ ہے" گھمنڈی بولا، "میں ان کے سامنے باہر نہیں جاؤں گا۔"

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا، "تو نے منسی کا کنٹھا اتار لیا ہے، جو باہر نہیں جاتا؟"

لیکن گھمنڈی باہر نہ گیا۔ ماں منھ میں دوپٹہ ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ ماں منھ میں دوپٹہ اس وقت ڈالا کرتی تھی جب کہ وہ نہایت پریشان یا حیران ہوتی تھی۔ اور اپنے کلیجے میں مکّہ اس وقت مارا کرتی تھی جب کہ بہت غمگین ہوتی۔ اس سے پہلے

تو گھمنڈی کسی سے شرمایا نہیں تھا۔ وہ تو محلے کی لونڈیوں میں ڈنڈ پیلا کرتا تھا۔ عورتوں کے کوٹھوں پر سے بچّے چھین لیتا اور انہیں کھلاتا پھرتا۔ اور اسی اثنا میں عورتیں گھر کا دھندا کر لیتیں اور گھمنڈی کو دعائیں دیتیں۔ اور آج وہ منسی اور چچی سے بھی جھینپنے لگا تھا۔

گھمنڈی نے واپس آتے ہوئے اپنے باپ کے زمانے کا خریدا ہوا ایک پھٹا پُرانا موم جامہ نیچے بچھایا، اور ایک ٹوٹا ہوا شیشہ اور رال سامنے رکھ کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ ٹانگوں پر چند سخت سے پھوڑوں پر اس نے رال لگائی اور پھر شیشے کی مدد سے منھ پر رسنے والے پھوڑے سے پانی پونچھنے لگا اور پھر اس پر بھی مرہم لگا دی۔ ماں نے اپنی دُھندلی آنکھوں سے منھ والے پھوڑے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، ”ہائے، کتنا کھُون کھراب ہو گیا ہے تمھارا۔“ اور پھر کرنجوا اور نیم کے نسخے گنانے لگی۔

اس وقت تک رات ہو گئی تھی۔ رال لگانے کے بعد گھمنڈی موم جامے پر ہی دراز ہو گیا اور لیٹتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج ماں کو بھی جلدی سو جانے کا موقع تھا، لیکن وہ اونچے مونڈھے پر جوں کی توں بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ

بستر میں جا دبکنے پر وہ نسبتاً بہتر رہے گی، لیکن ایک خوشگوار تساہل نے اسے مونڈھے کے ساتھ جکڑے رکھا اور وہیں سکڑتی گئی۔ اس کا بڑھاپا اس میٹھی نیند کے مانند تھا جس میں پڑے ہوئے آدمی کو سردی لگتی ہو اور وہ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر کلیجے سے لگاتا چلا جائے۔ لیکن پاؤں میں پڑے ہوئے لحاف کو اٹھانے کے لیے ہِل نہ سکے۔

ایکا ایکی ماں چونکی۔ اسے اپنے بیٹے کی خاموشی کا پتہ چل گیا تھا۔ اس نیم خوابی میں بڑے بڑے راز کھُل جاتے ہیں۔ ماں نے کلیجے میں مارنے کے لیے مُکّا ہَوا میں اٹھایا، لیکن وہ وہیں کا وہیں رک گیا اور وہ پھر ایک حسین غشی میں کھو گئی۔ لیکن اسے گھمنڈی اور اس کے ساتھ اس کا باپ یاد آتا رہا اور اس کی خشک آنکھوں میں داستانیں چھلکنے لگیں۔ ہوا کے ایک جھونکے سے دروازے کے پٹ کھُل گئے اور ایک سرد بگولے کے ساتھ باہر سے گوندی اور بِل کے پتّے، گلی میں بکھرے ہوئے کاغذوں کے ساتھ اڑ کر اندر چلے آئے۔ ایک سوکھا ہوا بِل کہیں سے لڑھکتا ہوا دہلیز میں اٹک گیا۔ گھمنڈی نے اٹھ کر دروازہ بند کرنا چاہا لیکن بِل کو نکالے بغیر کامیابی نہ ہوئی۔

گوندی کے شور اور جھینگروں کی آواز نے ماں کے خون کو اور منجمد کر دیا۔ شمع دان میں دِیے کا شعلہ اور متوازی ہو رہا تھا۔ گھمنڈی نے کہا، "بستر پر لیٹے گی ماں؟" لیکن ماں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گھمنڈی نے سر ہلا کر ماں کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور جوں کا توں کھاٹ پر رکھ اوپر لحاف دے دیا۔ ماں کو خود پتہ نہیں تھا کہ اگر وہ وہیں پڑی رہتی تو صبح تک سردی سے اکڑ جاتی۔ پھر وہ کبھی سیدھی نہ ہوتی اور وہیں ختم ہو جاتی۔

ماں کو بازوؤں میں اٹھائے ہوئے شاید گھمنڈی نے کچھ بھی محسوس نہ کیا، لیکن ماں نے بڑا حظ اٹھایا اور اس کے بعد لحاف کی گرمی و نرمی نے اس کو حظِ اکبر میں تبدیل کر دیا۔ کبھی ماں نے بیٹے کو گود میں اٹھایا تھا۔ ماں نے سوچا اور پھر ہلاس کی ایک چٹکی نتھنے میں رکھ کر اس نے زور سے سانس لیا۔ وہ حظ کی اس سطح پر آچکی تھی جہاں مر کر انسان اس خوشی کو دوام کرنا چاہتا ہے۔ آج اس کے بیٹے نے اسے گودی میں اٹھایا تھا اور اسے بستر کی قبر میں رکھ دیا تھا۔ وہ بستر جو قبر ہو نہ سکا۔ دنیا میں کوئی عورت ماں کے سوا نہیں۔ اگر بیوی بھی کبھی ماں ہوتی ہے تو بیٹی بھی ماں۔ تو دنیا میں ماں اور بیٹے کے سوا، اور کچھ نہیں۔ عورت ماں ہے اور مرد بیٹا۔

ماں کھلاتی ہے اور بیٹا کھاتا ہے۔ ماں خالق ہے اور بیٹا تخلیق۔ اس وقت وہاں ماں تھی اور بیٹا۔ ماں، بیٹا۔ اور دنیا میں کچھ نہ تھا۔

ماں بدستور خواب اور بے خوابی کے درمیان معلق تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی، لیکن اس کے تخیّل کی شکلیں بے قاعدہ ہو کر خواب کے ایک اندھیرے جوہڑ میں ڈوب رہی تھیں۔ اس کے گاؤں کے چند مکان اس کی گلی میں آئے تھے، لیکن کسی پراسرار طریقے سے ان مکانوں کے پیچھے بھی وہی دھوبیوں کا محلّہ آباد تھا۔ وہاں بھی وہی بِل اور گوندی کے درخت۔ سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اماوس کی رات کاجل ہو رہی تھی اور بیٹے کا چاند ان ظلمتوں کو پاش پاش کر رہا تھا۔ اس کا شوہر، جسے وہ غلطی سے مرا ہوا تصور کرتی تھی، زندہ تھا اور اس سے صبح کے وقت ''اَدھ بلوئے'' کی کٹوری مانگ رہا تھا۔ اسے پیاس لگی تھی۔ ایک نہ پی ہوئی شراب کے نشہ سے اسے بری طرح اعضاء شکنی ہو رہی تھی، لیکن اس کا خاوند تو مر چکا تھا۔ دس سال ہوئے مر چکا تھا۔ مرے ہوئے آدمی کو کوئی چیز دینا گھر میں کسی اور متنفّس کو خدا کے گھر بھیج دینے کے مترادف ہے، لیکن وہ انکار نہ کر سکی۔ وہ بیوی تھی اور ماں۔ اس نے اپنے شوہر کے منھ کے ساتھ لگا ہوا کٹورا چھین لیا،

لیکن کیوں؟ اس کا شوہر مرا تھوڑے ہی تھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ وہی کٹا ہوا سا ہونٹ جس میں سونے کے کیل والا دانت دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں بھی اس دانت کو ڈھانپنے سے قاصر تھیں۔

دروازے پر دستک سنائی دی اور ماں کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے ایک غلاف سا اترا، لیکن اس پر ایک غلاف تھا جو اس کے سارے بدن کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ وہ پڑی رہی۔ پڑی رہی۔ اس کے پاؤں، جو کچھ دیر پہلے سرد اور لکڑی کی طرح سخت تھے، کچھ گرم ہو گئے تھے۔ شاید گھمنڈی نے ہمیشہ کی طرح رگڑ رگڑ کر اس کے پاؤں گرم کیے تھے۔ ماں اپنے تخیّل میں ہنسی۔ گھمنڈی بھی اسے مرتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ بیوی آجائے تو کچھ پتہ نہیں۔ لیکن اب اس گھن لگے ہوئے شریر کا کیا ہے؟ ہلاس۔ ہلاس کدھر گئی۔ ماں سو گئی۔ لیکن دروازے پر دستک کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ بنواری اور رشید بھی پھر گھمنڈی کو بلانے آئے تھے۔ ماں کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔ گھمنڈی پھر ٹھیک ہو جائے گا، لیکن صد گونہ اضطراب ہوا۔ ان کی سنگت پھر گھمنڈی کو بگاڑ دے گی۔ اس وقت بڑھیا کو جاگ آئی۔ جاگتے ہی پہلی بات جو ماں

کے ذہن میں آئی، وہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے گھمنڈی کے باپ کو اَدھ بلوئے کا کٹورا مُنہ سے لگانے نہیں دیا۔ اگرچہ وہ کس قدر پیاسا تھا اور اس کا عضو عضو ٹوٹ رہا تھا اور وہ بڑی التجا آمیز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک گھونٹ بھی پی چکا تھا، لیکن ماں نے سمجھنا چاہا کہ اس نے کچھ نہیں پیا، اور وہ سمجھ گئی۔ اس نے دروازے میں کھڑے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، اور اس قدر دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں صدقے لال“ کہ وہ خود بھی اپنی آواز کو نہ سن سکا۔ اسی طرح اس نے ایک اَن سنا بوسہ ہوا کی لہروں میں چھوڑ دیا۔

اپنی ماں کو سوتا دیکھ کر گھمنڈی باہر آ گیا اور بولا۔ ”میں سینما کے علاوہ اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ یار کہے دیتا ہوں۔“

”نکل باہر سالے۔“ رشید نے گالی بکتے ہوئے کہا۔ ”نکلتا ہے یا“

ماں کے دماغ میں ٹڈیوں اور جھینگروں کی آواز دوسری آوازوں کے ساتھ برابر آ رہی تھی، اگرچہ وہ قریب قریب سوئی ہوئی تھی۔ گھمنڈی نے باہر سے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔

کسی خیال کے آنے سے ماں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے پھر اپنا شوہر یاد آیا۔ اور بیٹا جو شکل اور عادات کے لحاظ سے اپنا باپ ہو رہا تھا، لیکن کمسنی اور بلوغت کے درمیان ہی تھا۔ چند ہی دنوں میں بالغ ہو جائے گا، پھر اسے لُگائی کی ضرورت ہو گی۔ماں نے دل میں کہا۔ ''مجھے پتہ ہے اَب گھمنڈی باہر کیوں نہیں جاتا؟''

ماں جانتی تھی گھمنڈی اپنے باپ سے زیادہ حساس واقع ہوا ہے۔ جب وہ پی کر آئے تو اسے جتا دینا بڑی مور کھائی ہے۔ اور پھر اگلی صبح پلّو سے چونّی کھول کر دینا بھی تو ایک چپت ہے۔ چپت۔ چپ چاپ چپت۔ شراب پی کر آئے ہوئے خاوند۔بیٹے سے جوتی پیزار کرنا اور چونّی کھول کر دینا، یا سرہانے کے قریب پانی کا کٹورا رکھ دینا ایک ہی قسم کی بد سلوکی تو ہے۔ بلکہ یہ بات جوتی پیزار سے کہیں زیادہ دل آزار ہے۔ اسی لیے گھمنڈی کے باپ نے اس کے سامنے کبھی آنکھ نہیں اٹھائی۔ باپ میں شخصیت کو کُچل دینے کی وہی تو ذمہ دار تھی، اور اب بیٹے کو مار رہی ہے۔ ماں نے دل میں تہیّہ کیا کہ اب وہ کبھی اپنے پلّو میں دہی کے لیے چونّی نہیں باندھے گی اور نہ صراحی، سرہانے کے قریب رکھے گی۔ اور وہ خود کُڑھے گی لیکن بیٹے کو کچھ نہیں کہے گی۔ اسے یہ پتہ نہیں لگے گا کہ میری ماں

سب کچھ جان گئی ہے۔ گھمنڈی کے باپ کا بھی خیال تھا، کہ اگر گھمنڈی کی ماں واویلا یا احتجاج کرتی، تو اس وقت تو ضرور برا معلوم ہوتا لیکن آخر میں کتنی آسانی رہتی۔ پہلے تو اس عادت سے خلاصی ہو جاتی، اور اگر یہ لت رہتی بھی تو اس قدر شرمندگی کا منھ نہ دیکھنا پڑتا۔ اب جب کہ وہ خاموشی سے پانی کا کٹورا سرہانے رکھ دیتی ہے اور جلدی جلدی ہلاس نتھنوں میں ڈالتی ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ شاید گھمنڈی اس تازیانے کی چوٹ نہ سہ سکا تھا اور اس نے شراب پینا اور دیر سے گھر آنا ترک کر دیا تھا۔ خیر آج سے گھمنڈی پی کر آئے گا تو وہ کچھ نہیں سمجھے گی۔ کچھ نہیں کہے گی۔

رات کے گیارہ بجے ہوا کے جھونکوں اور گوندنی کے پتّوں کے ساتھ گھمنڈی بھی داخل ہوا۔ آج ہَوا گھمنڈی سے زیادہ شور مچا رہی تھی۔ ماں بدستور چھت کی کڑیاں گن رہی تھی اور من ہی من میں کوئی بھولا بِسرا بچھوڑا گا کر نیند کو بھگا رہی تھی۔ گھمنڈی نے آتے ہی دونوں ہاتھوں میں پھونک ماری۔ ہاتھوں کو رگڑا اور ماں کے پاؤں تھامتے ہوئے بولا،

"ماں!"

اور ماں کو جاگتے ہوئے پا کر بولا۔

"ارے !تو سو کیوں نہ گئی ماں؟"

ماں نے وہی مختصر سا جواب دیا۔

"اب ان دیدوں میں نیند کہاں رے گھمنڈی!"

لیکن اس سے آگے وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ گھمنڈی بالکل ہوش میں باتیں کر رہا تھا۔ آج اس نے ایک قطرہ بھی تو نہیں پی تھی۔ اب جو ماں نے کچھ نہ سمجھنے کا تہیّہ کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟ ماں سچ مچ ہی کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ کچھ بھی نہ جان سکی۔

پت جھڑ جو ہونی تھی سو ہو چکی تھی۔ اس دفعہ پُروا کے آخری جھونکے اور تو کچھ نہ لائے، ایک مہمان لیتے آئے۔ ماں نے گھمنڈی کو بلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! لے یہ چپنی بدل لا۔"

محلّے میں چپنی بدلنے کی رسم خوب چلتی تھی۔ ماں پکی ہوئی سبزی چچی کے ہاں بھیج دیتی اور وہاں سے خالی برتن میں پکی ہوئی ترکاری آجاتی۔ اس تبادلے میں بڑی بچت تھی۔ دوسری سبزی بنانے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی تھی اور کھانے میں وہ

بات پیدا ہو جاتی تھی۔ اور چچی سے چپنی چلتی بھی خوب تھی، لیکن گھمنڈی نے یوں ہی گھڑے ایسا سر ہلاتے ہوئے کہہ دیا۔

"میں اب بڑا ہو گیا ہوں ماں۔ میں کہیں نہیں جانے کا۔"

"لو ایک نئ مصیبت۔" ماں نے کہا اور خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "تو بڑا ہو گیا ہے تو کا؟"

اس وقت مہمان کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھمنڈی نے موم جامہ جھلنگے کے قریب بچھار کھا تھا اور اس پر دہی رال لگا رہا تھا۔ ان پھوڑوں کو آرام آتا تھا پر نہ آتا تھا۔ ماں نے دامن کی ہَوا کرتے ہوئے رِستے ہوئے پھوڑوں پر سے مکھیاں اڑائیں اور بولی۔ "تیرا تو کھون بالکل کھراب ہو گیا ہے۔"

اور دراصل گھمنڈی کا خون خراب ہو گیا تھا۔ اس کے باپ دادا نے اسے پاک پوتِر خون دیا تھا، لیکن بیٹے نے خون میں تیزاب ڈال دیا اور خون پھٹ گیا۔ جسم بھی ساتھ پھٹنے لگا۔ کچھ مجرمانہ نگاہوں سے گھمنڈی نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ماں! مجھے گرمی ہو گئی۔"

ماں کے سارے تیور، سوال کی صورت میں اٹھ گئے۔ اور اس نے فقط اتنا کہا۔
"کاؤ؟"

گھمنڈی نے جھلنگے کی لٹکتی ہوئی رسّیوں کو تھامتے ہوئے کہا۔ "یہ رشید کی کرتوت ہے۔" اور بے اختیار روتے ہوئے بولا۔ "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ماں!"

ماں نے ایک دفعہ پھر کہا۔ "کاؤ؟"

اور گھمنڈی کی حدّت شعلہ بار ہو گئی۔ اس نے ماں کو ایک گالی دینا چاہی لیکن وہ رُک گیا۔ گھمنڈی اب خود بھی چاہتا تھا کہ ماں کو اس کے آزار کا پتہ چل جائے۔ بیٹے کو روتے دیکھ کر ماں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ روگ تو جی کے ساتھ لگا ہوا ہے، لیکن اتنا خون خراب کبھی کسی کا نہیں ہوا۔ اور اس نے سوتے میں اپنے مرحوم خاوند کو اَدھ بلویا پلا دیا تھا۔

مجبور ہو کر گھمنڈی پھر بلوغ، گمراہ بلوغ کی داستان رونے لگا۔ آج سے پچاس سال پہلے اس بلوغ کو زندگی کے درخت پر اس قدر پکنے نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ سڑ کر

اپنے آپ نیچے گر پڑے اور پھر دنیا جہان کو متعفّن کر دے۔ ماں، جس کی شادی دس سال کی عمر میں ہو گئی تھی، اس بات کو نہیں جانتی تھی۔ جس طرح بدن کے علم سے ناواقف لوگوں کے لیے پیٹھ کا ہر حصّہ کمر ہوتا ہے، اسی طرح اس نا واقف، نا سمجھ اور نادان ماں کے لیے یہ خون کی خرابی، گرمی یا کوڑھ سے پرے کچھ نہیں تھی۔ اور یہ سب کچھ کرنجوا، نیم اور اسپغول کے 'سحر' کے آگے نہ ٹھہر سکتا تھا۔

اب ماں 'کاؤ' نہیں کہنا چاہتی تھی، اگرچہ اسے کسی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی جب سے گھمنڈی کا خون خراب ہوا ہے، وہ بہت متلوّن ہو گیا ہے۔ گھر میں چیزیں پھوڑنے لگتا ہے اور جو بہت کچھ کہو، تو اپنا سر فرش پر دے مارتا ہے۔

ماں خود ہی چپنی بدلنے چلی گئی۔ گھمنڈی کی چچی نے اپنے ہاں پکی ہوئی ترکاری تو دے دی، لیکن ان کے ہاں کی پکی ہوئی چیز قبول نہ کی۔ ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ دس سال سے وہ رنڈاپا اکیلی کاٹ رہی تھی اور اس نے کسی شریک کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ آج جب کہ وہ کل کے تمام اسرار سے واقف ہو چکی تھی، بھلا کیوں جھک جاتی؟ ماں اپنی دیورانی کے ساتھ جی کھول کر لڑی۔ دیورانی نے بھی دھتّا بتایا اور

کہا۔ ”دیکھا ہے ہم نے، اتنی بڑی ناک لیے پھرتی ہے تو۔ بیٹے کو سنبھالا ہوتا جو بازار میں جھک مارتا پھرتا ہے۔“

ماں ٹھیک کہتی تھی، کہ 'چپنی بدلنے' سے گھمنڈی کا تعلّق؟ تو جو برتنا نہیں چاہتی تو یوں کہہ دے۔ لیکن دراصل ماں کو کوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ خون خراب گھمنڈی کا ہوا ہے اور وہ گالیاں رشید اور بنواری کو دیتا ہے۔ دیورانی برتنا مجھ سے نہیں چاہتی اور صلواتیں گھمنڈی کو سناتی ہے۔

لیکن محلے کی دوسری عورتیں بھی ماں کو مطعون کرتی تھیں۔ ماں سخت پریشان ہو رہی تھی۔ آخر منشی جی سے لڑائی ہوئی۔ اس نے ڈانٹا کہ اگر گھمنڈی نے ہمارے مکان کے ارد گرد کہیں پیشاب کیا، تو اس سے برا کوئی نہ ہوگا۔

آخر مہمان کے سمجھانے سے ماں کو پتہ چل گیا۔ اس نے نہ صرف اپنا سر پیٹا، بلکہ ایک دوہتڑ بیٹے کے بھی جما دیا۔ ہائے تو نے باپ دادا کا نام ڈبو دیا ہے رے! پڑوسن کے ساتھ پھر لڑائی ہوئی اور ماں نے کھری کھری سنا دیں۔ ”حرام خور تجھے وہ دن یاد ہے جب تیری باہمن حرام کروا کے نکلی تھی باوا کے گھر سے۔ نہ اندھا دیکھا تھا نہ کانا۔ کرنے کی تھی۔ اور وہاں جا کر گھڑا پھوڑ دیا تھا، جانے کس کس کا

گریب ایسر کے سر پہ۔ اور گھر آ کر ماں گھمنڈی کو کوسنے دیتی۔ گھمنڈی جب سب حکیموں سے مایوس ہو تا تو ماں کی حکمت میں آرام پاتا تھا۔ لیکن ماں اسے گالیاں دیتی تھی۔ گور بھوگ لے تو کو۔ اب دنیا گھمنڈی کی آنکھوں میں آبلہ تھی۔ ایک بڑا آبلہ جو اُتّر سے دکھن اور پورب سے پچھّم تک پھیلا ہوا تھا اور جس میں پیپ کے دریا رِس رہے تھے۔

رات ہو گئی۔ ماں جھلنگے میں پڑی ابھی تک ٹھنک رہی تھی۔ "یہ بیماری کہاں سے مول لے لی رے میرے دشمن! سارا جسم پھوڑے پھوڑے ہو چکا ہے۔ یہ بیماری آگ ہے نری آگ۔ یہ امیروں کی دولت ہے۔ میں غریب عورت اس آگ کو کیسے بجھاؤں؟۔ میں ویدوں کو کیا بتاؤں؟ میں تمہاری ماں ہوں رے گھمنڈی! شریک مجھے طعنے دیتے ہیں۔ پڑوسی مجھے کھڑا کر لیتے ہیں اور عجیب بے ڈھنگے سوال کرتے ہیں رے۔۔۔" گھمنڈی قریب پڑا ہر قسم کی شرم و حیا سے بے نیاز، ایک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چھت میں لگے ہوئے نرکل اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے اور جھینگر اس کے دماغ میں بولنے لگے تھے۔ اب تک ہوا کے جھونکوں میں تلخی کی نمایاں رمق پیدا ہو کر اس کے جسم کے ایندھن میں

اور شعلے پیدا کر رہی تھی۔ کواڑ بھی کھلے ہوئے تھے۔ گوندی، سموم کے جھونکوں میں کراہ رہی تھی اور آسمان پر بدنما داغوں والا آتشک زدہ چاند اپنی یرقانی نظروں سے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد گھمنڈی کی آنکھوں میں پیٹ کی تخمیر نے ایک غیر مرئی دُھند سی پھیلا دی۔ اس کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہوئیں۔ نرکل چھت پر چلے گئے۔ جھینگروں نے زبان بند کرلی۔ پھوڑے رِسنے بند ہوگئے۔

سب دنیا سو رہی تھی لیکن ماں جاگ رہی تھی۔ اس نے بیس کے قریب ہلاس کی چٹکیاں نتھنوں میں رکھ لیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ دائیں ہاتھ سے اس نے دِیا اٹھایا اور گھسٹتی ہوئی اپنے بیٹے کے پاس پہنچی۔ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ گھمنڈی سویا ہوا تھا، لیکن ماں کی شفقت اس کے روئیں روئیں میں تسکین پیدا کر رہی تھی۔ ماں نے بیٹے کی طرف دیکھا، مُسکرائی اور بولی۔

”میں صدقے، میں واری۔ دنیا جلتی ہے تو جلا کرے۔ میرا لال جوان ہو گیا ہے نا اسی لیے۔ ہائے مرے تیری ماں بھگوان کرے سے۔“

نامراد

صفدر، نقش بندوں کے ہاں کا بڑا لڑکا کالج سے گھر لوٹا، تو کھانا کھا کر قیلولہ کے لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جس میں لکھی ہوئی خبریں پیٹ میں تخمیر کے ساتھ دھندلی ہوتی گئیں۔۔۔ ہوتی گئیں۔۔۔ صفدر کو پتہ تھا کہ وہ سو رہا ہے، اس کے اعضاء ایک تفریح اور تفرج کے قائل ہو رہے تھے۔ آپ سے آپ یہ خیال بھی اس کے دماغ میں آیا کہ مرتے وقت بھی تو کچھ اس قسم کا عالم ہوتا ہے۔ جسم کے اعضاء تھک کر چور ہو جاتے ہیں، اور ایک ایسی

تفریح اور تفرج کے قائل، جس کا کوئی انجام نہیں۔ صفدر سو گیا لیکن وہ مرا نہیں۔

تفرج کا احساس کہاں۔ ابھی اس کے اعضاء نے تفریح بھی نہیں پائی تھی کہ اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، لیکن وہ کھل نہ سکیں۔ پلکوں کے لطیف پردوں میں خواب کی شاہراہیں۔۔۔ شریانیں، شرابی ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں دبائیں اور کھولیں۔ وہ اس منظر کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اس خبر کے لیے تیار نہ تھا جو آج کے اخبار میں نہیں چھپی تھی۔ بڑے نقشبند، امیر علی نقشبند، اس کے والد کھاٹ کے پاس کھڑے تھے اور قریب ہی ماں دروازے میں کھڑی کسی دکھ کے اظہار میں آنسو بہا رہی تھی۔

"اٹھ بیٹا۔۔۔ ارے اٹھ بھی، اس قدر غافل مت ہو۔"

غافل کا لفظ نقشبندوں کے ہاں کثرت سے استعمال ہوتا تھا، اور اس کے معانی بھی مختلف تھے۔ ان معانی سے مختلف جن میں ہم تم اور زید بکر اسے استعمال کرتے

ہیں۔ نقشبند تمام کے تمام بڑے متّقی اور پرہیز گار لوگ تھے۔ ان کے خیال کے مطابق خدا کی یاد کے علاوہ جو وقت بھی گزرتا تھا غفلت میں گزرتا تھا۔ کھانا پینا، نصاب رٹنا، سینما دیکھنا، سونا، سب غفلت میں شمار ہوتا تھا۔ صفدر نے اپنے آپ اندازہ کر لیا کہ نماز کے متعلق کچھ کہتے ہوں گے، اور وہ جی چرا کے سونے لگا۔ جب بڑے نقشبند نماز، تسبیح اور روزہ استغفار کے متعلق کچھ کہتے، تو صفدر جگر کا ایک شعر پڑھ دیتا۔

محو تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں

زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش کہاں

اس شعر میں انسان کے لیے کس قدر آزادی تھی۔ وہ ثواب میں بھی آزاد تھا تو گناہ میں بھی آزاد، گناہ بھی عبادت تھی۔ پودوں کے ہوا سے سر ہلانے کا عالمگیر اثبات، پرندوں کے چہچہے، ستاروں کا ایک انجانے مرکز کے گرد طواف، یہ سب کچھ عبادت تھی جو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہو رہی تھی۔ بڑی مچھلی کا چھوٹی مچھلی

کو کھالینا، انسان کا انسان کو کچل دینا، بطلان کا حق پر چھا جانا۔ یہ سب کچھ عبادت ہی تو تھی۔ لیکن اگر وہ کاہل نہ ہوتا، اگر وہ سست نہ ہوتا تو اس کی عبادت مکمل ہو جاتی، کیونکہ ماں اور بڑے نقشبند بھی اس شعر کو کاہلی کا ایک جواز سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں زندگی کے دریا میں بہتا ہوا تنکا ایک ارادہ رکھتا تھا۔ چاہے کس قدر بے بضاعت تھا وہ، لیکن چند لہریں تھیں جو اس سے خوف کھاتی تھیں، اس تنکے سے، اس پر کاہ سے۔۔۔ لیکن ماں کی سسکیاں، یہ محض وہ غفلت نہ تھی، صفدر گویا بجلی کے کسی ننگے تار سے چھو گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بڑے نقشبند نے متانت سے کہا "بیٹا! اٹھ کپڑے بدل لے۔ تمہارے سسرال سے بلاوا آیا ہے۔"

"میرے سسرال سے؟" صفدر نے حیرت سے پوچھا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ماں!"

ماں نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے کہا "نامراد! اٹھ۔۔۔ جا تجھے میری

خوشدامن نے بلایا ہے۔“

”نامراد“ اور ”خوشدامن“ کے الفاظ کچھ عجیب طریقے سے استعمال کیے گئے تھے۔ وہ نامراد کا لفظ اس وقت کہا کرتی تھیں جب وہ گور میں پٹے، خون تھوکے، کی معنوی حد سے ورے، بہت ورے محبت اور نفرت کی اُلجھنوں میں خفیف سی خفگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آج اس نے نامراد کچھ اس طرح کہا تھا جیسے اس کا بیٹا صفدر واقعی نامراد ہو۔ اور اس کی منگیتر کی ماں کو وہ خوشدامن کے نام سے کم ہی پکارا کرتی تھی۔ وہ صرف رابعہ کی ماں کہہ دیتی تھی۔ صفدر کا ماتھا ٹھنکا۔ آج خوشدامن کے لفظ پر زور دینے اور دہلیز پر کھڑے آنسو بہانے کی یہ وجہ تو نہیں کہ ماں کے ہاتھ سے خوشی کا دامن چھوٹ گیا ہے اور رابعہ کی ماں کے ہاتھ سے بھی؟

لیکن کیا مضائقہ ہے؟ صفدر نے پل بھر میں سوچ لیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھائے، لیکن بڑے نقشبند کو دیکھ کر رُک گیا۔ ان کے سامنے سگریٹ پینا، گھر بدر ہونا تھا۔ لیکن اپنی لاپروائی کا اظہار کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ صفدر

نے جھک کے چارپائی کے نیچے سے، بوٹ کٹوا کر بنائے ہوئے سلیپر نکالے اور انہیں پہن کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ماں کی طرف خالی خولی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"کیا رابعہ کی ماں نے کوئی اور رشتہ دیکھ لیا ہے؟ یا۔۔۔؟" وہ اپنے آپ کو فریب دینا چاہتا تھا۔۔۔ بالفرض محال اگر رابعہ، رابعہ بے چاری کو کچھ ہو گیا ہو، تو پھر اسے بلانے کی کیا ضرورت ہے؟

نیچے زینے پر دھم دھم کی آوازیں آنے لگیں۔ سڑک پر کھلنے والی کھڑکی سے گھر کے زینہ کا آخری حصّہ بھی نظر آتا تھا۔ گھر میں کون ہے، یہ دیکھنے کے لیے صفدر نے کھڑکی کو کھولا اور نیچے جھانکا۔ جمن تھا۔ رابعہ کا نوکر۔ شاید یہی وہ خبر لایا تھا جسے ایکا ایکی بتا دینے میں بڑے نقشبند اور اس کی ماں ایک قدرتی خوف کی وجہ سے تامل کر رہے تھے۔ اس وقت ابھی دوپہر ڈھل رہی تھی کہ آسمان پر سلاروں کی قطاریں بڑے بڑے اور سست پروں کی طرح اڑنے لگیں۔ شہر کا دھواں گاڑھا ہو رہا تھا اور شہر کو پیش از وقت اندھیرے میں مبتلا کر رہا تھا۔

ماں ابھی تک کچھ بول نہ سکی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ پیدائش، شادی اور

موت، تینوں موقعوں پر اپنے جذبات کو لفظوں سے آسودہ نہیں کر سکتی تھی۔ بڑے نقشبند نے ارد گرد کوئی کرسی نہ دیکھی تو صراحی والی تپائی لے کر بیٹھ گئے، جس پر سے عرصہ ہوا صراحی ہٹا دی گئی تھی۔ بولے۔۔۔ ''بیٹا! یہ بڑی بُری خبر ہے، تمھاری رابعہ چل بسی۔'' ماں نے اپنا منھ چھپا لیا اور پھر جلدی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگی۔ صفدر اس خبر کے لیے تیّار نہ تھا، لیکن اس نے حیرانی سے منھ کھول دینے کے علاوہ اور کچھ نہ کیا۔

نقشبند، زمانے کی دوڑ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ صفدر کو اس بات کا شدید گلہ تھا۔ اس لڑکی کے لیے اسے کیسے افسوس ہو سکتا تھا، جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا کہ رابعہ مر گئی ہے تو کیا ہوا؟ اسے صرف اس قدر افسوس ہوا جتنا کسی راہ چلتے کو میّت مل جانے سے مرنے والے پر ہوتا ہے۔ شاید اس سے کچھ زیادہ، کیونکہ رابعہ کا نام اب اس کے نام کے ساتھ لیا جاتا تھا اور اس کے کان رابعہ صفدر، صفدر رابعہ کی گردان سے مانوس ہو گئے تھے۔ جب پہلے پہل وامق عذرا، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ کے نام اکٹھے لیے گئے ہوں گے، تو

کانوں کو کس قدر ٹھیس پہنچتی رہی ہو گی۔ لیکن اب یہ نام گھریلو بن گئے تھے۔ روز مرہ، اسی طرح رابعہ اور صفدر کے نام روز مرہ تھے۔ آج رابعہ امتحان دے رہی ہے۔ آج صفدر تقریر کر رہا ہے۔ رابعہ کس قدر خوبصورت ہے اور اتنی اچھی صحت والی۔۔۔ صفدر۔۔۔ صفدر گوراچٹا ہے۔ رابعہ سرخ بہت ہے اور اس لیے کچھ کھولائے ہوئے خون کی طرح سیاہی مائل۔ صفدر کو کچھ رنج ہوا۔ اس نے سوچا صفدر رشیدہ، صفدر منور، صفدر نزہت۔ لیکن اس کے کانوں کو کچھ برا معلوم ہوا۔ اس نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"ابا جان مجھے افسوس ہے۔ لیکن میں جا کر کیا کروں گا؟"

اماں جان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "بیٹا! یہ تو ٹھیک ہے، لیکن تمھاری رابعہ کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے۔"

صفدر کو لفظ 'تمھاری' کے دہرائے جانے پر جی ہی جی میں ہنسی آئی۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کی تھی، لیکن کسی نے اس طور پر اسے صفدر کے ساتھ منسوب نہیں

کیا تھا۔ اب مر کر وہ اور بھی تمھاری ہو گئی تھی۔ اب جب کہ وہ دراصل کسی کی بھی نہ تھی۔ لیکن وہ مر کیسے گئی، یہ اب تک صفدر نے نہ پوچھا تھا۔ درحقیقت وہ اس خبر سے بھونچکا سا رہ گیا تھا، لیکن نقشبندوں کے ہاں کی جھوٹی حیا کی خاطر اس نے حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا،

"ماں، کل تو مجھے اس کا بھائی ملا تھا۔۔۔"

بڑے نقشبند نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا صفدر!۔۔۔ بے چاری اچانک چل بسی۔ اچانک۔۔۔ اسے ایک خاص بیماری تھی۔"

اس خاص بیماری کے متعلق صفدر کچھ نہ پوچھ سکا۔ اس نے کپڑے اتارنے کے لیے کھونٹی کا رخ کیا اور اس کے ہاتھ خود بخود لباس میں کالے عنصر والی چیزوں کی طرف اٹھ گئے۔ خاص بیماری؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورتوں کو کوئی قسم کی کہنے اور نہ کہنے لائق بیماریاں ہوتی ہیں۔ اس کے گھر میں خود

اس کی ماں ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا رہتی ہے۔ گھر کے سب طا قچے شیشیوں سے بھرے رہتے تھے۔ جیسے اسے کتابیں سجانے کا شوق تھا، اسی طرح اس کی ماں کو شیشیاں سجانے کا۔ لیکن دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتے وقت کوئی شیشی نہ ہوتی تھی اور بڑے نقشبند سٹپٹایا کرتے تھے۔ وہ جتنا ماں کو اس بیماری کے متعلق پوچھتا، اتنا ہی اسے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا۔ ''پیٹ درد ہے۔ سر دکھ رہا ہے۔ چھاتی پھنک رہی ہے اُبکائیاں آ رہی ہیں۔'' وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اور اب اس نے عورتوں کی بیماریوں کے متعلق پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورتوں میں برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور وہ عام طور سے بیماریوں سے بچ نکلتی ہیں۔ لیکن رابعہ مر گئی۔

صفدر نے پوچھا، ''میّت کب اٹھے گی، میاں جی؟''

میاں جی نے جواب دیا، ''آٹھ بجے۔ اس سے پہلے نہ اٹھ سکے گی۔''

ماں نے کہا، ''ایک بھائی جالندھر میں دکان کرتا ہے، اسے بھی تار دیا گیا ہے۔''

”آپ بھی شامل ہوں گے؟“صفدر نے پوچھا۔

”کسی پہ احسان تھوڑے ہے۔“

صفدر نے اصرار کرتے ہوئے کہا، ”میاں جی، میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔“

صفدر نے دیکھا، اس قسم کے سوال بڑے نقشبند کو کچھ درست نہیں معلوم ہو رہے ہیں، انہوں نے اپنے ہونٹ کاٹے اور کہا ”تم میری بات مانو گے یا اپنی کہے جاؤ گے؟“

صفدر نے سر جھکا لیا۔ماں دخل دیتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”بیٹا، رابعہ کو تمھارے پہنچنے کے بعد نہلایا جائے گا۔“

اور ماں فرط غم سے رونے لگی۔ اس نے دیوار کے ساتھ اپنا سر مارتے ہوئے کہا۔

”ہائے میری بیٹی۔ میں تجھے بہو بنا کر لاتی اس گھر میں۔“

صفدر کو اور بھی حیرت ہوئی۔ لیکن وہ بغیر مزید سوال کیے چل دیا۔ سیڑھیاں
اترتے ہی اسے جمن مل گیا۔ جمن بڑی شدّت سے صفدر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی
آنکھوں سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ وہ روتا رہا ہے۔ صفدر نے کہا۔ ''جمن!'' لیکن
جمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صفدر کو دیکھ کر پھر سے رونے لگا۔ صفدر نے کہا
''چلو۔'' اور جمن روتا ہوا ساتھ ہو لیا۔ صفدر چلتا گیا اور سوچتا گیا۔ اس کے جانے
کے بعد ہی رابعہ کو نہلایا جائے گا۔ کیوں؟ کیوں؟ رابعہ کے ہاں لوگ سخت
پردے کے قائل تھے۔ آج اس کا، اس گھر میں دخل کیسے ہو گا؟ اس گھر میں،
جس میں اسے داماد بن کر، سہرے باندھ کر داخل ہونا تھا۔ وہ اندر کیسے جائے گا؟
اس نے اپنی ''تمھاری'' کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ ''نامراد'' تھا۔ ماں اور خالہ کے
کہنے کے مطابق رابعہ خوبصورت تھی، ہزاروں میں سے ایک۔ لیکن اگر وہ شادی
کے بعد بدصورت نکلتی تو وہ کیا کر لیتا؟ اس سے کسی نے پوچھا نہیں تھا۔ ممکن ہے
لوگ لمبوترا چہرہ ناپسند کرتے ہوں۔ لیکن اسے ایسا چہرہ پسند ہے، اور اس نے
بچپن سے ہی ایک خاص قسم کے گوشوارے اپنی دلہن کو پہنانے کا ارادہ کر رکھا

ہے، جو لمبوترے چہرے پر اچھے دکھائی دیں۔

جمن بڑی خاموشی سے میلا کچیلا تولیہ کندھے پر ڈالے، ننگے پاؤں صفدر کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ صفدر بابو کے نقوش پا پر اپنے پاؤں رکھ کر چل رہا ہے۔ لیکن صفدر نے اس مضروب جذبات والے فرماں بردار نوکر کو باتوں سے آزمانا نہ چاہا۔ اور وہ چلتا گیا۔ اسے دو سے تین فرلانگ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں اور بازاروں میں سے، جہاں بہت ہی شور و شغف تھا، گزرنا تھا۔ ممکن ہے رابعہ کو اپنا منگیتر یاد نہ ہوتا۔ اور صفدر نے اپنے گورے چٹے ہاتھوں کو دیکھا، اور بازار میں چلتے ہوئے ایک بہانے سے سوڈا واٹر والی دکان میں لگے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال سلجھے ہوئے نہیں تھے، لیکن اس کے چہرے سے ایک حسین بے نیازی دکھائی دے رہی تھی، جسے صفدر نے خود بھی محسوس کیا۔ لیکن یہ تو "عطار بگوید" والی بات تھی۔ اس وقت دوپہر شام میں ڈھل چکی تھی۔ کبوتروں نے اڑ اڑ کر تاروں پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک کبوتر نے ستم ظریفی سے صفدر کے کوٹ پر بیٹ کر دی۔ جمن نے دوڑ کر اسے تولیہ سے

پونچھ دیا۔

"رہنے دو۔۔۔" صفدر نے کہا۔ "میں ایسی ہی ذلّت کے لیے پیدا ہوا ہوں۔"

وہمی صفدر نے یہ فقرہ یونہی کہہ دیا۔ لیکن اس سے جمن کو بہت تسلّی ہوئی اور وہ اب تک یہی سوچتا آ رہا تھا کہ صفدر کو رابعہ بی بی کے مرنے کا ذرا بھی افسوس نہیں۔ لیکن صفدر اپنی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ اسے افسوس تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ سکے۔ اور دکھاوے کے لیے وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ عجب کیا، جو اسے ناپسند کرتے ہوئے رابعہ نے کچھ کھا لیا ہو، اور خوف سے اس کا جسم اور روح کانپنے لگے۔ شاید رابعہ کی ماں نے اپنی اسی حماقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اسے بلایا ہو۔ لیکن ایسی باتیں کہنے کے لیے تو اسے دنیا کے ماں باپ کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا۔

ایک جگہ صفدر نے پیچھے مُڑ کر جمن کو پکارا۔

جمن نے کہا، "ہاں سرکار۔"

”بی بی کو کیا تکلیف تھی؟“

جمن کا گلا پھر رقت سے بھر آیا۔ اس نے کہا۔

”بڑا جلم ہوا سرکار۔ بڑا گھور جلم ہوا۔“

”رابعہ بی بی نے کھا لیا کچھ؟“

”ہے ہے۔“

جمن نے دونوں ہاتھ ہلاتے اور کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”رابعہ بی بی ایسی نہ تھی صفدر بابو۔۔۔ اس ایسی نیک لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ تمھاری نوکرانی نے بتایا ہے۔“

”ہماری نوکرانی؟“

صفدر نے حیرت سے پوچھا اور پھر کہا۔

”اچھا۔۔۔ تمھاری بیوی نے!“

جمن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”کنواری بی بی کے متعلق یہ بات کہنے لائق نہیں ہے۔ جو میں گناہ کرتا ہوں تو۔۔۔“ اور یہ کہتے ہوئے جمن نے زمین پر سے مٹی چھوئی اور کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”تو اللہ بخش دے۔ بی نہانے والی تھی کہ اس نے ٹھنڈے پانی سے نہالیا اور اس کے بعد وہ بالکل جڑ گئی۔“

”نہانے والی تھی تو نہالیا۔“ صفدر نے حیرت سے پوچھا اور پھر سمجھتے ہوئے بولا۔ “اوہ۔۔۔ہاں۔۔۔ میں سمجھ گیا جمن۔ اس میں گناہ کی کون سی بات ہے؟“

اور پھر دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔ صفدر کا بلانا، اس کے لیے اور بھی معمّہ بن گیا۔ اسے ایک گونہ تسلّی ہوئی کہ رابعہ اپنے منگیتر کی وجہ سے مایوس نہیں ہوئی۔ وہ اس قدر اچھی لڑکی تھی، اسی لیے وہ ”نامراد“ تھا۔ صفدر کو پھر محسوس ہوا کہ وہ رابعہ کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر رہا ہے۔ کوشش سے۔ محنت سے۔ دراصل اسے اپنے آپ کو کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ شاید ماتم کدے میں پہنچ کر اس کا دل

پسیج جائے۔ لیکن اگر اس سے رویا نہ گیا تو بری بات ہو گی، اور اگر وہ رو دیا تو اور بھی بری بات ہو گی۔

صفدر کے خیالات پیچھے کی طرف دوڑ گئے، جب رابعہ کی ماں لڑکا دیکھنے آئی تھی، جب اس نے صفدر کو دیکھا تھا۔ مجھے دیکھا تھا اور رابعہ کو کسی نے نہ پوچھا تھا۔ وہ خود رابعہ تھی، ورنہ وہ کس طرح اسے پسند کر سکتی تھی؟ اس وقت وہ رابعہ کی ماں کا داماد نہیں تھا۔ وہ ایک لڑکا تھا، خوش شکل، متناسب جسم والا۔ ایک مرد۔۔۔ اور رابعہ کی ماں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رابعہ کے لیے یہ مناسب بَر ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں رابعہ اور صفدر کو اکٹھے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ کیا اچھی جوڑی تھی۔ لیکن اس وقت رابعہ کہاں تھی؟ تخیّل میں صفدر کے ساتھ کھڑی رابعہ کی ماں تھی، رابعہ نہیں تھی۔ اور صفدر کو ان فرسودہ رسموں سے نفرت تھی۔ کیوں نہیں اسے رابعہ کو دکھایا گیا؟ اور کیوں نہ رابعہ اسے دکھائی گئی۔ اب رابعہ مر چکی ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا۔ وہ کیوں ان کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتا؟ اب اسے کیوں بلایا جا رہا ہے۔ اسے چڑانے کے لیے؟ ان

پابندیوں پر آنسو بہانے کے لیے؟ سر پیٹنے کے لیے؟

"آفتاب منزل" کے سامنے پہنچ کر صفدر کھڑا ہو گیا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ ایک پراسرار قسم کی خاموشی، جو عام طور پر ماتم والے گھر میں نہیں ہوتی۔ شاید ماتم کرنے والے صبح سے رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے۔ ان کے گلے سوکھ گئے تھے اور اب ان کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا۔ یہ خاموش رونا تھا، جو نالوں سے کہیں زیادہ تھا۔ دکھاوا تو تھا نہیں، جوان بیٹی دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلی گئی تھی۔ صفدر رُک گیا۔ وہ خود حیران تھا کہ وہ اس گھر میں کس طرح داخل ہو رہا ہے۔ رابعہ کو بھی اس قسم کی تعلیم نہ دی گئی تھی، جس سے وہ یہ حرکت نہ کرتی۔ وہ شرم و حیا کی پتلی، عفّت اور پاکیزگی کا مجسمہ ایک جھوٹی شرم کا شکار ہو کر رہ گئی۔ کیا اس نے مرنے سے پہلے ایک بار بھی صفدر کے متعلق سوچا؟۔۔۔ نہیں قطعاً نہیں۔ اسے کیا معلوم صفدر کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کا کوئی خیالی دولھا ہو گا، جیسے ہر لڑکی کا ہوتا ہے۔ لیکن وہ صفدر نہیں ہو گا۔ وہ کوئی اور ہو گا۔ ایسے ہی جیسے اس کی خیالی دلہن یقیناً رابعہ سے مختلف ہو گی۔ اور وہ رابعہ کے لیے اسی طرح محسوس کرے

گا، جیسے اس نے کسی بھی مرنے والی لڑکی کے لیے محسوس کیا ہو۔ وہ اس گھر میں کیا استحقاق رکھتا ہے؟ وہ کیوں داخل ہوا۔ اسے کیا حق ہے؟۔۔۔ وہ آگے بڑھا۔ ٹھٹکا۔۔۔ بڑھا۔ اسے جمن کو بھیج کر بلایا گیا ہے۔

رابعہ کی چھوٹی بہن قمر، جو منگنی میں بھی صفدر کے ہاں آئی تھی، دوڑی ہوئی باہر آ گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ”دولھا بھائی آ گئے۔“ صفدر نے اپنی طرف دیکھا۔ وہ دولھا بھائی تھا، کالے کپڑے پہن کر اپنی دلہن کو لینے آیا تھا۔ اسے سب کچھ عجیب معلوم ہوا، ایک ڈھونگ، ایک نیم سیاسی چال۔ اسے یہاں کیوں بلایا گیا تھا؟ رابعہ کا بھائی آیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کی قمیص کے بٹن کھل رہے تھے۔ شلوار کا ایک پائنچہ اوپر نیفے میں تھا اور دوسرا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ وہ مادے کے احساس سے اوپر، روح کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ روح، جس نے جسم کا حلیہ بگاڑ دیا تھا، وہ چیخا اور اس نے صفدر کو بازو سے پکڑ لیا۔ گویا وہی ان کا مجرم تھا۔ وہ اسے دولھا بھائی کہنا چاہتا تھا، لیکن اس نے نہ کہا۔ وہ فقط روتا رہا۔ بالغ آدمی کا رونا، جو ہر عمر کے انسان کے رونے سے زیادہ کریہہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ

رونا نہیں چاہتا لیکن روتا ہے۔ پھر اس کے چہرے کے تناؤ کسے جاتے ہیں اور وہ انہیں چھپاتا ہے۔

صفدر گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں برتن اور کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ رابعہ کی ماں بال بکھیرے بیٹھی تھی۔ وہ جھول رہی تھی۔ فرطِ غم سے وہ ایک جگہ بیٹھ نہ سکتی تھی۔ وہ جیتی تھوڑے ہی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ رابعہ جیتی تھی۔ رابعہ کی ماں مر چکی تھی۔ صفدر کو دیکھتے ہوئے اس نے نہایت خوفناک آواز سے چلّانا شروع کیا۔ ایک بند دروازوں والے کمرے کے اندر سے بھی کسی بزرگ آدمی کے رونے کی آواز آئی۔ غالباً یہ رابعہ کے باپ تھے، جو کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتے تھے۔ اب صفدر کو رونے کے لیے کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

رابعہ کی ماں گرتی پڑتی اٹھی اور وحشیانہ انداز سے صفدر کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔ ''بیٹا! تو اس گھر میں سہرے باندھ کر آتا، بیٹا میں تیرے شگن مناتی، میں تیرا سر چومتی، لیکن میں رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ اللہ کو میرا رونا

منظور تھا۔" صفدر کے سامنے ایک لاش ڈھکی پڑی تھی۔ ماں باپ، ساس سسر کے ارمانوں کی لاش۔ رابعہ۔۔۔ صفدر۔۔۔ صفدر کو رونے کے لیے کوئی بھی کوشش نہ کرنا پڑی۔ اس کے دل میں ایک ابال سا آیا وقتی ابال، جو شاید رابعہ کو سامنے پڑے دیکھ کر نہیں آیا تھا، بلکہ اپنے ارد گرد انسانیت کے دکھ درد کو دیکھ کر آیا تھا۔ رابعہ کی ماں نے کہا۔ "بیٹا! تو کیوں روتا ہے؟" لیکن رابعہ کی ماں نے اس کے رونے میں ایک خوشی، ایک تسکین سی محسوس کی۔ اگر وہ نہ روتا تو۔۔۔ صفدر کو رابعہ کی ماں نے آخر کس لیے بلایا تھا؟ رابعہ کی ماں نے کہا "بیٹا! تو کیوں روتا ہے، تیرے لیے دلہنیں بہتیری۔ میرے لیے بیٹی نہیں کوئی۔ میری رابعہ مجھے کہیں نہیں ملے گی۔" صفدر نے جی ہی جی میں غصّہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تمھارے اوہام! تمھاری جھوٹی حیا کا شکار لڑکی شاید اب تمھیں نہ ملے گی۔ شاید تم اس سے اس کھوٹے سکے کے طلبگار نہ ہو گے۔ تم لوگ ظالم ہو۔ بے رحم۔۔۔ میں ظالم ہوں، بے رحم اور سنگ دل۔ شاید میں دل کی تہہ سے آنسو لاتا، لیکن اب رابعہ کون ہے؟۔۔۔ یہ میری دلہن نہیں۔"

رابعہ کی ماں نے صفدر کو روتے دیکھا تو خاموش ہو گئی۔ نہ جانے کیوں خاموش ہو گئی اور پھر بولی۔ ”بیٹا!، تو مت رو، میں تیرے لیے دلہن لاؤں گی۔ رابعہ سے بھی زیادہ خوبصورت۔ اس سے بھی زیادہ لمبے بالوں والی۔ تیری روتی ہے پیزار لیکن میری بیٹی نامراد جا رہی ہے اس دنیا سے۔ اسے ایک بار دیکھ لے۔ اس کی شادی یہی ہے کہ تو اسے ایک نظر دیکھ لے۔ دیکھ دیکھ میں تجھے کیا دے رہی تھی۔ نصیبوں جلے۔

صفدر اس بات کے لیے تیّار نہ تھا۔ اسے اپنے ماحول سے نفرت ہو رہی تھی۔ ایک عجیب طرح کی ہمدردی آمیز نفرت، ان بکھرے ہوئے برتنوں، ان پھٹے ہوئے کپڑوں، اس کفن۔۔۔ اس لاش۔۔۔ سے ایک قسم کی ہمدردی اور نفرت۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اسے پورا بھروسا تھا کہ اسے ناحق پریشان کیا جا رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ مرنے والی کی روح کو ناحق اذیّت دی جا رہی ہے۔ محض خودغرضی، محض اپنی آسودگی کے لیے وہ اس ماتم والے گھر میں اس ”دوسری لڑکی“ کے متعلق کچھ بھی سننے کے لیے اور پھر مرنے والی کی ماں کے منھ سے۔

اسے حیرت ہوئی۔ لیکن وہ چپ رہا۔ وہ بھاگ نہ سکا۔ ایک خاص قسم کا تحیّر اس پر چھا گیا، جو مردے کو دیکھنے کے لیے ہر زندہ شخص پر چھا جاتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ڈر جائے گا، لیکن وہ رابعہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے سہاگن بنانا چاہتا تھا۔ وہ نامراد تھی اور صفدر خود نامراد تھا۔ رابعہ کی ماں نے رابعہ کے منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ رابعہ خون کے کھولنے کی وجہ سے سیاہی مائل بتائی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کا خون کھول نہیں رہا تھا۔ اس کا خون سرد ہو گیا تھا، جم چکا تھا۔ سرخی اور زردی نے مل کر ایک عجیب قسم کی سفیدی پیدا کر دی تھی۔ ہَوا میں اس کے بالوں کی ہلتی ہوئی لٹ سے اس کے زندہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ کس قدر خوبصورت تھی۔ موت میں اور بھی حسین ہو گئی تھی۔ اس کا لمبوترا چہرہ، جس پر صفدر کے تخیل میں بسے ہوئے گوشوارے کتنے مناسب دکھائی دیں۔ لیکن وہ سب غیر مانوس تھا۔ وہ اس گھر کا دولھا تھا، لیکن ایک اجنبی تھا۔ اور پھر ایک دولھا! رابعہ کی ماں اسے کوئی کم درجہ دینے کو تیار نہ تھی۔ اس نے ایک بار پھر چِلّاتے ہوئے کہا، ”صفدر بیٹا! دیکھ میں تجھے کیا دے رہی تھی۔ میری بیٹی نامراد جا رہی ہے۔ نہیں، میری بیٹی نامراد

نہیں ہے صفدر۔۔۔"

صفدر نے پھر ایک دفعہ بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رابعہ نامراد ہے یا وہ خود۔ صفدر۔۔۔ جو دونوں ایک دوسرے سے نامحرم ہیں۔۔۔ یا رابعہ کی ماں نامراد ہے، جو دونوں کو جانتی ہے۔

کشمکش

بڈھاموہنامر رہاتھا۔ اس کی آنکھوں کے کونوں تک مفت کی بن مانگی ہلدی بکھر
گئی تھی۔ چھت، الگنی، سنڈاس، بچوں اور سایوں کی طرف دیکھنے کی بے
بضاعت، بے سود کوششوں سے ظاہر تھا کہ اس ساون سوکھے، نہ اساڑھ ہرے۔
جسم میں زندگی کی حرص وہَوا ابھی تک باقی ہے۔ بُڈھے کی نگاہِ واپسیں سے
عزیزوں کو ہمدردی نہیں تھی، نفرت تھی۔ آخر جو آدمی ہفتے بھر سے روز جیتا روز

مر تا ہو، خدا جانے اس کی کون سی نگاہ نگہِ واپسیں ہوتی ہے۔

باہر اسلحہ خانے کے برابر ایک تنہا ٹرام، شرابی کی طرح لڑکھڑاتی کھڑکھڑاتی شور مچاتی گزر رہی تھی، یا قریب ایک رکشا قلی زور زور سے اپنے گھنگھرو رکشا کے بموں پر مار رہا تھا۔ اسے اپنے سیپ کا موتی اگلنے کی جلدی تھی۔ اور وہ یوں تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا جارہا تھا جیسے تیز قصابی چھری کراچی کی مچھلی کے گداز جسم میں سے گزر جائے "باچو، باچو، ہے پوسے۔۔۔" ایک ہجوم ہنستا کھیلتا، روتا، گھر، تھیٹر اور جہنّم کی طرف جارہا تھا۔ اور موہنا کا بتیس سالہ بیٹا راجہ اپنے دونوں بیٹوں اور آدھی بیٹی یعنی لنگڑی چھوکری کو بچانے کے لیے ایک پھٹے ہوئے ڈھول کی آواز میں چیختا، حتیٰ کہ اس کی رفیقۂ حیات، جو بچے پیدا کرنے اور پھر انہیں فحش گالیاں دینے کی حد تک ہی راجہ کی رفیقہ تھی، اپنی رفاقت کا پورا حق نبھاتی۔ "اوطوں مارو، ہیضے کے توڑو اُٹھ جاؤ دنیا سے، ارے سارے جمانے کی گلٹی نکل ری، اور ان کے گلٹی بھی تو نا نکلتی۔" گویا بچے ٹرام کے نیچے آکر تو نہ مریں، طاعون اور ہیضہ انہیں بھلے ہی لے جائیں۔

راجہ نے ایک طویل سی جمائی لی اور آخ۔۔۔ کی ایک آواز کے ساتھ اپنے اٹھے ہوئے بازوؤں کو نیچے گرا دیا، دو چھوٹے بھائی، ایک بہنوئی اور ایک مسلمان پڑوسی پچھلی رات سے جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ پٹوال سے پڑے دکھائی دیتے تھے اور پانی بے تحاشہ بہہ رہا تھا، جیسے آنکھوں کی دکھتی رگوں پر کوٹا ہوا پھونکا جلا جست باندھ دیا گیا ہو۔ ان لوگوں میں سے جب کوئی تھوڑی دیر کے لیے اونگھ لیتا، تو یوں محسوس کرتا جیسے جست کے باوجود اس کی آنکھوں پر بالائی باندھ دی گئی ہے۔ سب کی خواہش تھی کہ موہنا ایک طرف ہو۔ اب جب کہ وہ بالٹیوں کا تلہ بھی نہیں لگاتا، کچھ اس لیے کہ بول وبراز بھی چارپائی پر ہوتا اور کچھ اس لیے کہ چارپائی پر مرنا بیٹوں کے لیے بھاری ڈنڈ تھا۔ اس ہفتے میں چھ سات بار موہنا کو زمین پر رکھا گیا اور اس کے ہاتھوں پر آٹے کا دیا رکھ کر اسے سورگ کا راستہ دکھانے کی کوشش کی گئی۔ ابھی کانوں کی لویں سیاہ اور سرخ تھیں اور روشنی آر پار چلی جاتی تھی، اور ناک کے قریب کانسی کی تھالی کرنے سے کچھ مرطوب سے بخارات جم جاتے۔ موہنا کے دماغ کے کسی کونے

میں امید اور لواحقین پر مایوسی چھا جاتی۔ زمین کچی تھی اور ٹھنڈی۔ اس پر موہنے کو رکھنے سے یوں ہی جان نکل جاتی۔ موہنے کا مرنا تو سب چاہتے تھے، لیکن اذیّت دینے سے گھبراتے تھے۔ کچھ گندم ابال رکھی تھی، کچھ دان کیا تھا، لیکن بے سود۔ ابھی موہنا مرا، ابھی جی اٹھا۔

راجہ کی جورو نے باہر جھانکا۔ سرطانی سورج صبح سے کھوپڑیاں چٹخار رہا تھا۔ لیکن اب کہیں سے اپنے آپ ہی بادل نمودار ہو گئے۔ ''اگر بارش ہو گئی تو بڑی مصیبت ہو گی۔'' وہ سوچنے لگی۔ نھوا، اس کا بیٹا، جسے گلے کی شکایت تھی اور جس کے حلق کا کوا نیچے گر گیا تھا، چاٹ کھا رہا تھا۔ راجانی نے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ صرف بازار سے رائی لانے کا حکم دے دیا۔ رائی سرہانے رکھنے سے جان جلد اور آسانی سے نکل جاتی ہے۔ اس وقت نھوا نے منھ بسورتے ہوئے کہا، ''میں ٹرام کے نیچے آ جاؤں گا ماں!'' اور راجانی خشمگیں ہو کر بولی، ''تو؟۔۔۔ تو تو مرتا بھی نا، تجھے توڑے سیتلا۔۔۔ تیرا مر جا باوا'' اور پھر اسی سانس میں اسے پچکارتے ہوئی بولی، ''ارے، لے اَدھنی۔ دیکھ ہماری سرکار نے نئ اَدھنی بنائی ہے۔ اب سونے

کی ادھنیاں بننے لگی ہیں۔۔۔ ارے دیکھ، بٹن کی پھانٹ پر پیر نہ رکھ دیجیو۔ پھر جائے گی پاؤں میں تلوار کے ما پھک۔"

جب راجانی اندر آئی تو ایک دفعہ پھر موہنا کو اتار کر چارپائی سے نیچے رکھ دیا گیا تھا۔ راجہ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے چھوٹے بھائی نے پھر جلدی سے ایک پھٹے ہوئے تکیے سے روئی نکالی۔ ہاتھ میں مل کر جلدی سے بتی بنائی اور راجانی کے بنائے ہوئے آٹے کے دیے میں رکھ دی۔ راجانی نے جلدی سے گھی ڈالا اور ایک بنا سپتی روشنی کوٹھڑی کی تاریکی پر غلبہ پانے لگی۔ پھر سے باوا کے ہاتھ پر رکھ دیا گیا۔ مسلمان پڑوسی نے سوجے ہوئے پاؤں کو ہاتھوں سے چھوا۔ پہلے وہ ٹھنڈے تھے، اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گرم ہو رہے ہیں، اور ٹخنوں پر ایک شریان یک لخت حرکت کرنے لگی۔ "قرآن پاک کی قسم۔" وہ بولا "موہنا باباجی رہا ہے۔ میں شرط بدتا ہوں۔" اور پھر جیب کے پیسے کھنکارتے ہوئے بولا۔ "بولو کتنے کتنے۔۔۔؟"

بیٹے ایک دفعہ پھر ہنس دیے اور پھر ایک پژمردگی سی ان پر چھاگئی۔

راجانی نے جھاڑو اٹھایا اور سنڈاس اور پھوس کی دیوار کے درمیان کا کچا حصّہ صاف کرنے لگی۔ راجا نے حلقے کے تھانیدار کے لیے ٹین کا حمام بنایا تھا۔ ڈھانچہ گول کیا ہوا کونہ میں پڑا تھا۔ انگیٹھی کی ٹوپی بھی بن گئی تھی۔ اب سب کچھ تپائی پر رکھنا تھا اور لوہے کی ربٹیں لگانی تھیں۔ تپائی چوکی کے قریب انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ایک پیادہ سپاہی کئی دفعہ ہو گیا تھا لیکن اس نئی مصیبت سے چھٹکارا حاصل ہوتا تب تو۔ ٹین کی ننھی ننھی کترنیں ہاتھوں سے اٹھا راجانی سنڈاس کے پاس ڈھیر لگانے لگی۔ کھٹیک منڈی کے نواح سے ایک گھاگھ آیا کرتی تھی اور سب بکھرا ہوا ٹین اور بے کار و مصرف لوہا کسی بیدار ملک کو پہنچانے کے لیے سمیٹ لے جاتی۔

پہلی ٹرام نے مسجد کے قریب اپنے مسافر چھوڑے۔ کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اس سے بھی پرے جانے والے تھے، اور کچھ سوار ہونے کو تھے۔ ٹرام چلانے والا ہتھی پر ہاتھ رکھے خلا میں گھور رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بلا ضرورت گھنٹی بجا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے بنانے والے نے خوب اس کا مضحکہ اڑایا ہے۔ بس سارا دن شہر میں چکر لگاتے رہنا اور پھر وہیں۔ کبھی ہوتا ہے کہ کوئی کتّا نیچے آ

کر مر جاتا ہے اور پھر منتظمین کمیٹی کو 'نیگلجنٹ ڈرائیونگ' کے سلسلے میں بیان دینے پڑتے ہیں۔ اس ہموار ساکن زندگی سے موت اچھی ہے۔ کلپ کلپ کلپ، اور چیکر بے تحاشہ ٹکٹیں مسافروں کے ہاتھ میں ٹھونس دیتا ہے۔ بس اس کا کام ہے ٹکٹیں دینا اور پھر ٹھیک سے دام وصول کر لینا۔ اس کی زندگی کا ارتعاش یہی ہے کہ پانچ سال سے بڑا بچہ بلا ٹکٹ سفر نہ کرے۔ اور اس کی ساری زندگی میں شاذ ہی کوئی حسین واقعہ پیش آیا ہو گا۔

ایک دفعہ میناری چوک سے ایک کنبے کا کنبہ چڑھا، جس میں ایک نوخیز لڑکی بھی چڑھی۔ ماں باپ اس لڑکی کو بلا ٹکٹ لے جانا چاہتے تھے۔ "ارے بھئی یہ تو بچہ ہے۔" ماں باپ چلائے "دیکھو۔ دیکھو۔ بھلا یہ لڑکی جوان ہے؟ یہ تو ریل میں مفت سفر کرتی ہے۔" چیکر کہنا چاہتا تھا۔ "کیا یہ جوان نہیں ہے؟ دیکھو۔ دیکھو۔" لیکن وہ جھینپ گیا اور پائیدان اور سیٹوں کے درمیان پاؤں جمائے کھڑا لوگوں کے فیصلے کا انتظار کرتا رہا۔ ماں باپ نے دو پیسے بچانے کے لیے چھوکری کو دو سیٹوں کے وسط میں کھڑا کر دیا اور نمائش شروع کر دی "دیکھو یہ جوان

ہے ؟۔۔۔ دیکھو۔۔۔" ایک نوجوان نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنے ساتھی سے کہا۔ "بھئی اس طرح تو پتہ نہیں چلتا" اور اس دن چیکر کو زندگی کچھ بامعنی معلوم ہوئی۔ پھر کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کلپ کلپ اور چیکنگ کو اس نے زندگی کا ایک حصّہ تو بنالیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اس سے بے طرح غیر مطمئن تھا۔ شاید ایک اور واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ ایک عورت اپنے خاوند کو چھوڑنے آئی تھی۔ اتنے مسافروں کے سامنے وہ اپنے راجا سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ راجا کسی دوسرے دیس میں جانے کے لیے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ اسباب پہلے پہنچ چکا تھا۔ عورت نے پوچھا۔ "اب کب آؤ گے ؟" مرد نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی اور کہا۔ "جب بھگوان لائیں گے۔" اور ٹرام چل دی۔ اس کے آہنی اور چوبی پشتوں پر کسی کے آنسو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ عورت بے بسی کے عالم میں اپنی کھوکھلی بیکار نگاہوں سے سڑک پر بچھی ہوئی لوہے کی چار لکیروں کی لامحدود تنہائی دیکھتی رہی۔

اب رائی بھی سرہانے رکھ دی گئی تھی۔ تین گھنٹے اور بڈھا بے حس و حرکت پڑا

رہا۔ اب کنپٹی کے پاس ابھری رگ پھڑ کنے لگی۔ موہنا کے منھ میں پانی کا ایک چمچہ ڈالا گیا۔ گڑ گڑ گڑ کی ایک آواز آئی اور اس کے بعد موہنے نے پانی پی لیا۔ راجا نے اپنا ہاتھ اس کی نبض پر رکھا۔ نبض چل رہی تھی اگرچہ ہولے ہولے۔ اس کے بعد یک لخت جیسے سب کچھ ساکن ہو گیا۔ پیشانی گرم تھی اور پھر وہ بانس کی سی ٹانگیں بھی حرکت میں تھیں۔ راجا نے برافروختہ ہو کر کہا،

"بابا کو رکھ دو چارپائی پر۔"

"کیسے رکھ دیں چارپائی پر۔" راجانی بولی۔

"کیسے رکھ دیں؟" راجا نے کہا۔ "جیسے اسے نیچے رکھ دیا ہے۔ اب یہ نہیں مرے گا۔ یہ ساری جندگی نہیں مرے گا۔"

"اور ڈنڈ کون دے گا جو مر گیا چارپائی پر؟"

راجا نے خشمگیں ہو کر چھاتی پر ہاتھ مارا اور بولا۔ "ڈنڈ میں دوں گا۔ درگا مائی کی قسم یہ بڈھا کبھی نہ مرے گا۔"

چھوٹے بھائی چاہتے تھے، کہ بابا ٹھنڈے فرش پر محض ٹھنڈک کی وجہ سے نہ مرے، لیکن چارپائی پر مرنے کے ڈنڈ سے وہ بھی گھبراتے تھے۔ بھائی کے چھاتی ٹھونکنے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ راجہ کے جسم پر سے ایک پھٹی پرانی پیوند لگی چادر علاحدہ کرتی ہوئی راجانی بولی۔

"ہم تو کبھی ڈنڈ نہیں دینے کے۔ ہماری جندگی ہی ڈنڈ دینے میں گجر گئی۔ چھوٹوں کو بڑا کیا، بیاہا، اب آنکھیں دکھاتے ہیں۔ جو کسی سے نیوندہ دھامالیا، وہ یہ دینے ہار نہیں۔ اب چارپائی کا ڈنڈ دے، اتنا امیر آیا ہے نا!"

پھر راجانی نے راجا کو چڑاتے ہوئے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ "جھٹ چھاتی بج اٹھتی ہے۔" مسلمان پڑوسی اشارے سے ان کو بک بک جھک جھک سے منع کرنے کے علاوہ منھ میں کچھ ورد کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی طبیعت اکتا گئی۔ وہ کوئی فرض پورا کر رہا تھا۔ اسے بار بار اپنی زخمی گھوڑی یاد آجاتی تھی جس کی جان نہیں نکلتی تھی اور اس کی بیوی اور بچے تھان کے قریب کھڑے رو رہے تھے۔ آخر راجانی نے کسی کو بلا کر گیتا کے اٹھارویں ادھیائے کا پاٹھ کروایا اور جوں ہی پاٹھ

کرنے والے آخری شبدوں پر پہنچے، گھوڑی نے جان دے دی۔ اور اب جب کہ موہنا گھوڑا بلکہ گدھا، جس نے ساری زندگی بار برداری اور ٹین کوٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا مر رہا تھا، تو مسلمان پڑوسی کو بھی لازم تھا کہ ان کی مدد کرے۔ لیکن اس بار اشلوک بھی کارگر نہ ہوئے۔ رائی سرہانے سے لے کر دروازے تک بکھر گئی۔ آخر بہت دیر بعد جب سب نے مل کر موہنا کو چارپائی پر لٹا دینے کا فیصلہ کیا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو اس کی پتلیاں پھر گئیں اور وہ فرش اور چارپائی کے درمیان ہی مر گیا۔ اس وقت دن تھا نہ رات۔

راجا نے چارپائی کے نیچے گھس کر ایک بڑا سا سرکنڈا نکالا۔ اس کو چھلکے سے صاف کیا اور لاش کے برابر کا ناپ کر اسے موہنا کے پاس رکھ دیا تاکہ ماپ رہے اور رات کو مردے کے جسم میں کوئی شیطان روح نہ داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ خود بخود جھینپ گیا۔

"کب لائے تھے تم سرکنڈا راجا بھیا؟" چھوٹے بھائی نے پوچھا، "ابھی لایا ہوں۔" راجا نے صریحاً جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "میرا مطبل ہے ابھی نھوا کے ہاتھ

منگوایا ہے۔" سب کھلی مار کر ہنس پڑے۔ یہ سرکنڈا دو ہفتے سے یہاں پڑا ہوا ہے۔ اتنی دیر سے ان لوگوں کو موہنا بابا کے مر جانے کی توقع اور خواہش تھی۔ اس کے بعد راجا نی ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس کا راجا پھوس کے لیے نمونہ لایا تھا، مگر سب بے سود۔ کھلی اور بھی اونچی ہو گئی۔

اگلی صبح محلے والوں کی رائے سے بابا کو بڑا کرنے کا فیصلہ ہوا۔ آخر پوتوں والا آدمی، زندگی کے سب فرائض سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اس کا جلوس نکالنے، اسے بڑا کرنے سے بیٹوں ہی کی عزّت تھی۔ بہوؤں کی مانگ میں سیندور ڈالا گیا، حلوان کشمیرے کی چادر، کفن اور جھنڈیوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ چھوٹے بھائی نے راجا اور منجھلے کی نسبت زیادہ روپے دیے۔ اس کے بعد چھوٹ کے لیے جٹ، چھوہارے اور میٹھے چنے وغیرہ منگوائے گئے اور صبح بوان اٹھایا گیا۔ آج پھر ٹرام والوں کے لیے ایک حسین واقعہ تھا۔ ایک بوان شمشان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے آگے گھنٹیاں بج رہی تھیں اور پیچھے کپڑے رنگے ہوئے سر منڈائے دو تین آدمی تھے۔ اس کے ساتھ دوسرے مرد اور عورتیں مل کر ایک گانا گا

رہی تھیں۔ یہ گھنٹی اور یہ سواریاں اور یہ جنازہ بردار! گویا یہ جلوس بھی ایک سست رفتار ٹرام تھی جو کہ بغیر ریل کے ایک معیّن راستہ پر جا رہی تھی اور سارا دن شہر کا چکر لگانے کے بعد شمشان کے باہر رک جاتی تھی۔ کچھ سائیکل والے اتر پڑے۔ ایک صاحب نے اپنا ہیٹ اٹھایا۔ ایک مسلمان جو بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا۔ ٹرام والے نے ایک لمحہ کے لیے بریک لگائی اور خلاء کی بجائے سرخ حلوان اور کشمیری چادر میں لپٹے ہوئے جسم کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ اس بوڑھے کے اپنے بچے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

اس وقت بوان کے اوپر سے میٹھے چنوں اور باداموں کی چھوٹ ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بادام ٹرام میں بھی آ گرتا۔ ایک عورت اپنے بچے کو ٹرام میں بٹھا نیچے اتر پڑی اور کچھ میٹھے چنے ہاتھ میں لے آئی اور واپس اپنے بچے کے قریب آتے ہوئے بولی، "لے بیٹا، لے کھالے۔ تیری عمر بھی اتنی لمبی ہو جائے گی۔ اس بُڈھے کی عمر سے بھی جیادہ۔"

ٹرام کے ڈرائیور، چیکر اور زندگی سے بے حد غیر مطمئن و مایوس ایک بابو نے

عورت کی اس حرکت کی طرف دیکھا اور پھر تینوں نے ایک دم اچک کر بوان پر
سے گری کے جٹ اور چھوہارے اتار لیے اور رغبت سے انہیں کھانے لگے۔
اس کے بعد ''چل میرے بھائی'' کی آواز آئی اور ٹرام لائنوں کے ایک جال میں
الجھنے کے لیے چل دی۔

جب میں چھوٹا تھا

ان دنوں ہم جہانگیر آباد میں رہا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کا وہاں ایک پرانا لیکن بہت بڑا امکان ہوتا تھا، جسے ہم پرتھوی بل کہا کرتے تھے۔ پرتھوی بل زمین کی طاقت، ہر جگہ بالعموم یکساں ہوتی ہے۔ لیکن شہر کی مٹی میں ہمیں وہ طاقت نہیں ملتی، جو پرتھوی بل میں میسّر آتی تھی۔ وہاں کی کششِ ثقل، ایک چیز ہی علاحدہ تھی۔

قدرت کی ہر اچھی چیز پرتھوی بل کے عین قریب مل جاتی تھی۔ ابھی کروندے

کا خیال آیا، باہر آ کر دیکھا تو بوا دتا اچارج، جو پھل بیچنے کے علاوہ مر جانے والوں کی آخری رسوم ادا کرتا ہے، کروندے اور سنگھاڑے بیچ رہا ہے۔ اگر اڑدیا کمر کھ کے متعلق سوچا تو وہ باہر موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے ہماری سوچ چند ایک کھٹے میٹھے پھلوں اور چند ایک لغو قسم کے کھلونوں تک محدود ہو، تاہم سب کچھ ہم تک اپنے آپ کھنچا چلا آتا تھا۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی ندی بہا کرتی تھی جس کے دونوں کناروں پر ایک ذخیرہ تھا۔ ہماری کہانیوں کے جن دیو اور پریاں، سب اس چھوٹے سے ذخیرے میں رہا کرتی تھیں۔ ہماری نگاہ ہمیشہ اس ذخیرے میں الجھ جاتی تھی اور جس طرح گھر کر آتے ہوئے بادلوں میں بچی کو اپنی مرضی کی شبیہہ مل جاتی ہے، اسی طرح اس ذخیرے کی ہر شاخ، ہر پتّہ ہمارے دل کی کہانی بن جاتا تھا۔ جب ہم بچے پر تھوی بل کے کھلے آنگن میں کبڈی، بارہ گٹال اور شاہ شٹاپو کھیلتے ہوئے تھک جاتے اور دماغ ایک نیا کھیل ایجاد کر لینے سے عاجز آ جاتا تو ہم ندی میں نہانے کے لیے چلے جاتے۔ حالانکہ وہاں جانا منع تھا۔ لیکن تمام

ممنوعہ چیزوں کو آزمانا، مثلاً سلائی کی مشین کی ہتھّی کو گھمانا، عشق پیچاں کو قینچی سے کاٹ ڈالنا، ہمارا محبوب ترین شغل تھا۔

کسی نے کہا ہے چھ سال کی عمر میں بچوں کے جسم خوراک سے، اور دل تجربہ سے بڑے ہوتے ہیں، لیکن ان کا تخیّل، ان کا شعور، مکاشفے سے بڑھتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ، نصیحت ان کے لیے بالکل بے معنی ہوتی ہے۔ ان کے شعور کے کسی کونے میں بھک سے اڑ جانے والا ایک جذباتی مادہ ہوتا ہے، جسے معمولی طور پر چھو دینے سے ان کا تصوّر ایک نیا رنگ، ایک نئی حد، یا دونوں وضع کر لیا کرتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سیلاب اُمڈ آتے ہیں۔ ان کے سپنوں کے رنگ چند نہ مٹنے والے نقوش اختیار کر لیتے ہیں۔

باوالوگوں کے اس بڑے کنبے میں، سب سے چھوٹا میں تھا۔ جب میں چھ برس کا تھا تو میرے والد کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ میرے والد کو نزلے کی دیرینہ شکایت تھی۔ وہ کچھ گنگنا کر بولتے تھے۔ ان کا دماغ آسانی سے خوشبو یا بدبُو میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی ان کی باتوں پر لوگ منھ پھیر کر ہنس

دیتے تھے۔ میں ہنستا بھی تھا اور افسوس بھی کرتا تھا۔ بوباس کے دماغ میں نہ سمانے پر اکثر انہیں خود بھی اپنے آپ پر رحم آیا کرتا تھا۔ نزلے کی وجہ سے ان کے سر اور داڑھی کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے، اگرچہ وہ جسمانی لحاظ سے کافی تنومند تھے۔ بیساکھی کے ارد گرد ہمارے گاؤں میں کسی نہ کسی کے ہاں ضرور بچہ پیدا ہو جایا کرتا تھا، اور وہ اپنے بچے کا نام رکھوانے کے لیے میرے والد کے پاس آیا کرتے تھے، اور والد صاحب بچے کا نام عمر دین، خیر و دین، نانک چند، فاطمہ وغیرہ رکھ دیا کرتے تھے، اور سب لوگوں کو وہ نام قبول ہوتا تھا۔ یہ نام اکثر بیساکھی کے روز رکھا جاتا تھا اور شیرینی بانٹی جاتی تھی۔ بیساکھی کی ہوا، جو گندم کو اس کے خوشے سے الگ کرتی ہے، ان کی نرم، ملائم اور سفید ڈاڑھی کو دو گچھوں میں بانٹ کر دونوں شانوں پر پھینک دیتی تھی۔ اور یہ نظارہ ہمارے دل میں ایک قسم کی ٹھنڈک اور پاکیزگی پیدا کرتا تھا۔

میرے والد کنبہ کے سب بچوں کو اکٹھا کر لیا کرتے تھے، اور ان کے شور و غل سے بچنے کے لیے انہیں کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ان کی کہانی عام طور پر ان کی

زندگی کے کسی خاص واقعہ سے تعلق رکھتی تھی اور اس میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ کہانی عموماً یوں شروع ہوتی تھی۔

"جب میں چھوٹا تھا تو۔"

میرے خیال میں بہت سے ماں باپ اور بہت سے بزرگ اپنے بچوں کو کہانی سناتے ہوئے اس فقرے سے شروع ہوتے ہیں جب میں چھوٹا تھا یا چھوٹی تھی۔ اور انجام کار یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ بچپن ہی سے مضبوط ارادے کے مالک تھے اور سچائی کے پتلے تھے۔ انہوں نے کبھی شرم وحیا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا اور بڑوں کے سامنے کبھی گستاخی سے پیش نہیں آئے۔ ان کے اخلاق کی بڑائی ان کے بچپنے کی ہر حرکت سے ظاہر تھی۔ ایسی باتیں سن کر میرا جی بھی یہی چاہتا کہ ان کی مانند نیک بن جاؤں۔ یہی میرا مطمح نظر تھا۔ مجھے اپنے والد، ایک بہت بڑی شخصیت دکھائی دیتے تھے، یا دوسرے لفظوں میں وہ ایک عظیم طاقت تھے، جس سے ضلع کا بڑے سے بڑا حاکم بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جہانگیر آباد کے سب آدمی ان کے سامنے تعظیماً سر جھکا

دیتے تھے اور "بڑے بابا" کے سوا اور انہیں کسی لقب سے یاد نہیں کرتے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میرے ہی باپ ہیں، لیکن وہ ایک تقدس مآب بزرگیت کی وجہ سے قصبہ کے سب لوگوں کے باپ۔ ایک پتامہا دکھائی دیتے تھے، جیسے خدا کل عالم کا باپ اور ایک پتامہا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، میرے والد نے خود ہی ایک عام پدرانہ سی پر شفقت روش اختیار کر رکھی تھی۔ کسی چھوٹے کے نزدیک آنے سے ان کا دایاں ہاتھ اپنے آپ آشیرواد کے لیے اٹھ جاتا تھا۔ یہ کس قدر ظلم تھا کہ اس عام پدرانہ روش میں پہلے جان بوجھ کر اور پھر عادتاً انہوں نے اپنے بہت سے قدرتی رجحانات اور جانب دارانہ جذبات اور خیالات کو کچل دیا تھا۔

ان کے بچپنے کی ایک کہانی ہم سب بچوں کو بہت بھاتی تھی۔ ہم بہت سے بچے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پرتھوی بل کے کھلے صحن میں بیٹھ جاتے اور اپنے بزرگ کی ایک ہی کہانی، ان کی زندگی کا سب سے ضروری واقعہ بار بار دہراتے۔ یہ بات بہت ضروری تھی کہ بالمکند کہانی کہے تو اسی انداز میں آنکھیں مٹکا کر اور چٹکی بجا

کر اور اگر شانتی وہ کہانی دہرائے، تو ویسے ہی آنکھیں مٹکا کر اور چٹکی بجا کر۔

میرے والد کی کہانی ہم سب بچوں کو اسکول کے پہاڑوں کی طرح ازبریاد، اور باسی روٹی کی طرح مرغوب تھی۔ اگر میں اس کہانی کا ایک لفظ بھی بدل دیتا تو باقی بچوں کے نزدیک کوئی بہت بڑا جرم کرتا۔ اس وقت میرے چچیرے بھائی، پھپھیرے بھائی، بہنیں فوراً احتجاج کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں۔ وہ کہانی چوہوں کے متعلق تھی اور ایک طرح سے ہمارا خاندان میں گیت بن چکی تھی۔

کہانی یوں تھی۔

جب بابا (والد صاحب) اور چچا دیوا چھوٹے ہوتے تھے تو ان کے دل میں چوہے پکڑنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس بڑے سے دیو صورت پر تھوی بل کی جگہ ان دنوں ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا مکان ہوتا تھا جس میں چوہوں کے بڑے بڑے بل تھے۔ چوہے ہر روز پنیر کی ٹکیہ یا بابا کی مرغوب باسی روٹیاں اٹھا کر لے جاتے۔ چچا دیوا نے ایک پنجرہ لگایا، سب چوہے پھنس گئے، ایک چوہا بھاگ کر سرنگ میں گھس گیا۔ اب آپ کو یہ جاننا چاہیے۔ (بچے اس بات کو نہ دہرائے جانے کو کبھی

برداشت نہیں کرتے تھے) سرنگ ایک بڑا لمبا چوڑا بِل ہوتا ہے جس میں سے چوہے گزر کر ذخیرے اور ذخیرے سے واپس اپنے مکان میں آجاتے ہیں۔ بابا نے ایک پنجرے کو سرنگ کے منہ پر رکھ کر اسے شہتوت اور کروندے، توریے کے گودے اور بیٔے کے گھونسلے سے ڈھک دیا۔ اگلی صبح چچا دیوا کی ہمّت نہ پڑی کہ وہ پنجرے تک چلے جائیں، اس لیے بابا اکیلے ہی گئے۔ اکیلے۔۔۔

(دہراتے ہوئے) "بابا اس ایک چھو۔۔۔ٹے سے بچے تھے۔"

"انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پنجرے پر سے پتّے ہٹائے تو کیا دیکھتے ہیں وہ وہاں ایک چوہا تھا۔ شتری رنگ کا، پورے قد کا"

"مٹکتا ہوا اور لٹکتا ہوا اینٹھتا ہوا، اور بھٹکتا ہوا۔"

"بابا اتنے گھبرائے، اتنے گھبرائے کہ جوتوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے۔"

)ہمارے لیے کہانی کا یہ حصّہ سب سے زیادہ سنسنی پیدا کرنے والا تھا(

”جوتوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے۔“

وہ بھاگ کر آئے اور چچا دیوا کو آواز دی۔ دیوا ہو دیوا، دیوا ہو اور آواز دیتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ اپنے منھ کے دونوں طرف رکھ لیتے، تاکہ آواز اِدھر اُدھر بکھرنے نہ پائے اور آواز سیدھی چچا دیوا تک پہنچے۔ پھر وہ اتنی زور سے چِلّاتے کہ آواز ایک چیخ میں بدل جاتی، پھر چیخ کھانسی کی صورت اختیار کر لیتی۔ ”کھونہہ، کھونہہ کھونہہ کھونہہ کھونہہ!“ پھر بابا اور چچا دیوا مل کر سرنگ تک چلے گئے جوتے پہنے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں شہتوت کے دو بڑے بڑے موگرے۔ بابا نے چوہے کو مار دیا، بالکل مار دیا، اور جہانگیر آباد کے چنڈالوں سے چوہے کی کھال کھنچوا کر اسے چھت پر رکھ دیا۔ جب کھال سوکھ گئی تو پھر انہوں نے اسے پھگو چنڈال کے ہاں بیچ دیا۔ پھگو نے اسے کسی اور کے ہاں بیچا۔ اس نے کسی اور کے۔۔۔ اور ایک آدمی نے اس کی فر بنادی۔ آج کل بڑی بھابی کے سوئٹر کو وہی فر لگی ہوئی ہے۔

اب معاملہ برداشت کی حد سے بڑھ جاتا۔ سب بچے جھوٹ جھوٹ، بکواس، بالکل

بکواس کا شور مچا دیتے۔ ''یہ ممکن، یہ ممکن نہیں کہ موٹی جرنیل بھابی کے خوبصورت سوئٹر کو ایک ذلیل چوہے کی فر لگی ہے۔''

آپ نے دیکھا اس واقعہ میں کوئی اصلاح کا پہلو نہیں ہے۔ اپنے والد کی زندگی کا یہی ایک واقعہ تھا جس سے ان کی کمزوری کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ خود کتنے ڈرپوک تھے، حالانکہ ہمیں ہمیشہ بہادر بننے کی تلقین کرتے تھے۔ بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے اس قسم کے واقعات، نام ونہاد ادب، تمیز اور دوسری نصیحت سے پٹی ہوئی کہانیوں سے زیادہ موثر ہوتے تھے، ان سے ہمیں حقیقت کا پتہ چلتا تھا اور ہماری سمجھ میں آتا تھا کہ ہمارے بزرگ بھی کبھی بچے تھے۔ ورنہ دوسری طرز کی کہانیوں میں وہ بچے کی جگہ ہمیں بوڑھے ہی نظر آتے تھے، گویا وہ ناف تک پہنچتی ہوئی داڑھی بچپن ہی سے ان کی ٹھوڑی پر موجود تھی۔

شرارت، لاعلمی، ایک قسم کی زندگی ہے، جس سے بچے پھلتے پھولتے ہیں۔ قدرت ان چیزوں کو بچوں کی جبلّت میں دے کر انہیں بڑھاتی ہے۔ ہم نے اپنے ارتقا میں دیکھا ہے کہ عقل اور علم وادب کے پیدا ہونے کے بعد جسمانی اور

روحانی ترقّی رُک جاتی ہے۔ بچوں کو عقل اور علم کی ضرورت ہے۔ مگر اسے آہستہ آہستہ گویا مکاشفے کے طور پر آنا چاہیے، نہ کہ اسے جھوٹ، سچ، طور بے طور ان پر ٹھونسا جائے۔ ان کی زندگی میں سلائی کی ہتھی کو گھمانا، بلا اجازت ندی میں نہانا، عشق پیچاں کو جڑ سے کاٹ دینا اور اس قسم کے سینکڑوں حادثات پیش آتے ہیں، جن سے ان کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ ان کی جبلّت کو دبایا جاتا ہے۔ لیکن کیا وہ دب جاتی ہے؟ اور اگر دب جاتی ہے تو کیا اسے دبا کر خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے؟

سردیوں کی ایک صبح کو بالمکند نے ایک گھوڑے کو تھان پر سے کھول دیا۔ بابا اسے پکڑنے کے لیے کھیتوں کے اونچ نیچ میں دوڑتے تھے۔ ان کی ڈاڑھی اڑتی تھی۔ ان کی سرخ نوکدار ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ کیا اچھا نظارہ تھا، اور اس سے ایک دن پہلے ہم سب آٹے کی چڑیاں بنانے کے جرم میں پِٹ چکے تھے۔

آخر ہمارے اخلاق کو بہتر بنانے اور ہماری عادتوں کو سنوارنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک استاد رکھ دیا جو سوائے ہمارے باقی سب کی عزّت کرتا

تھا۔ ہمارے استاد نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ہم میں سب سے زیادہ متابعت کرنے والے لڑکے کو 'باادب، باتمیز' کا سرخ نشان دے دیا جاتا تھا۔ اس جدّت سے ہم بہت متاثر ہوئے لیکن در حقیقت اس امتیازی نشان نے ہماری ذہنیت کو اس طرح غلام بنا دیا جیسے سرکار ہمارے کسی قومی بھائی کو دیوان بہادر یا خان بہادر بنا کر اس کے ہاتھ پاؤں کو حرکت اور آزادی کی زندگی کے عمل سے روک دیتی ہے۔

اس قسم کے اعزاز پانے والے لڑکے کو ہم بڑے رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اکثر باادب باتمیز کے الفاظ میں سے "ادب" اور تمیز کے دونوں الفاظ حذف کر کے ایک بکری کے بچے کی طرح با۔۔۔ با۔۔۔ ممیانے لگتے۔ اگرچہ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ہماری اس قسم کی حرکت میں انگور کھٹے ہیں کا جذبہ کار فرما ہوتا تھا، حقیقت اور آزادی کا تجسس کم تھا۔

بہار کے موسمی اعتدال نے آہستہ آہستہ اپنی میانہ روی چھوڑ دی اور اس کی خوش خلقی میں تلخ مزاجی بڑھنے لگی۔ یہ وہ دن تھے جب شہتوت کی کونپلیں پورے طور

پر پھوٹ نکلتی ہیں اور اس میں پھل پیدا ہو کر راہ رو کو للچاتے ہیں، اور چنار کے
چوڑے چوڑے پتّے اپنی گھنی چھاؤں سے ماں کی گود کا سا سکون دیتے ہیں۔ لمبے
لمبے توریوں، اس کے ارد گرد کے پھول پتوں میں زندگی پگمنٹس اور کلوروفل کی
صورت میں دوڑ جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک شام میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا۔ مجھے بھی وہ امتیازی نشان دے دیا
گیا۔ اس وقت مجھے اپنے ہم جولیوں کا ممیانا اور مجھ پر ایک طرح کی غدّاری کا
الزام لگانا بہت بُرا لگا۔ اسی بہار اور گرمی کے درمیانی موسم میں، میں ایک دن
پرتھوی بل کی چھت پر جا چڑھا۔ وہاں ایک چھجا تھا، جس کے ایک کونے پر
کھڑے ہونے سے سامنے کا نباتاتی ٹیلا اور شور مچاتی ہوئی ندی کی جھاگ پاؤں میں
کلیلیں کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ صرف سر پر لٹکتی ہوئی لمبی لمبی توریوں اور بیے
کے گھونسلوں کو پیچھے ہٹانا ہوتا تھا۔

چھجے پر سے مجھے وہ خاردار تار صاف دکھائی دیتی تھی، جس کے باہر باادب باتمیز
لڑکے نہیں جاسکتے تھے۔ وہ سرمئی کانٹوں سے بھرپور تار، سبز رنگ کے ستونوں

سے لپٹتی ہوئی پر تھوی بل کے بڑے پھاٹک تک پہنچتی تھی اور اس پر ننھی ننھی،
کالی، کالی جھانپلیں اپنا وزن درست کرتی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں۔ وہ سبز
سے ستون دور سے نہایت خوشنما وردی پہنے ہوئے سپاہی نظر آتے تھے، اور وہ
تار ہماری اخلاقی قرنطین تھی۔ ہمارے بزرگ نہیں جانتے تھے کہ وہ تار ہماری
قرنطین نہیں ہو سکتی تھی۔ انسان بغیر تار کے، بغیر کسی حد کے مقید اور محفوظ رہ
سکتا ہے۔ ضرورت ہے آزادی کی۔

میرے دیکھتے دیکھتے میرے تمام ہم جولی آئے اور کپڑے اتار کر پانی میں داخل
ہو گئے۔ ننگے دھڑنگے! کیسی آزادی تھی، جس میں سوچنے کی بھی فرصت نہ تھی!
تھوڑا سا خیال، معمولی سی سوچ بھی ایک تباہ کن تہذیب بن سکتی تھی۔ بالمکند نے
لکڑی کے ایک بڑے سے لٹھّے کو پانی میں ڈھکیل دیا اور خود اس پر منھ کے بل
لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چپّو کا کام کرنے لگے۔ میرا تصوّر چمک اٹھا، کنارے
پر شانتی اور سوماں مٹی اور دھول میں کھیل رہی تھیں۔ انہیں مٹی کے ساتھ کھیلنے
سے منع کیا جاتا تھا، لیکن وہ مٹی کے ساتھ اپنے رشتے کو سمجھتی تھیں۔ اس رشتے کو

جوماں باپ، بھائی بہن کے رشتے سے زیادہ گہرا تھا کہیں زیادہ گہرا اور ابدی۔

اسی دن میں نے بابا کو سب کا بلا اجازت ندی میں نہانے اور دھول سے کھیلنے کا واقعہ کہہ سنایا، لڑکیاں اور لڑکے پھر پٹ گئے۔

انسان کی فطرت کتنی آزادی کی طالب ہے۔ ملکی آزادی، جسمانی اور شخصی آزادی، روحانی آزادی۔۔۔ اس کا اندازہ کوئی با اخلاق غلام نہیں لگا سکتا۔ انسان تو چاہتا ہے کہ اسے روٹی کپڑے کی لعنت سے بھی آزاد کر دیا جائے۔

پرتھوی بل نے مجھے ذہین اور با اخلاق بنا دیا۔ میرے بزرگ بہت ہی خوش تھے کہ میں دوسرے بچوں کی طرح گستاخ نہیں تھا۔ لیکن مجھے معدے کی شکایت رہتی تھی۔ جو بچے جانوروں کی طرح چرتے رہتے، تندرست تھے۔ لیکن میں جو کھانے میں بہت احتیاط سے کام لیتا، ہمیشہ بیمار رہتا۔ ڈاکٹر کہتا تھا، ''نندی کو اینمیا ہے۔''

دیوان خانے میں صندل کی صندوقچی کے پاس ایک قلمدان رکھا تھا، اس پر چند

پیسے پڑے تھے۔ میں ایک لیمپ جلا کر اس کی مدھم مدھم روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ لیکن میرا دل میری سامعہ، شہتوت اور چنار کے پتوں سے گزرتی ہوئی ہوا کی سیٹیوں کی طرف متوجہ تھی۔ میرا منھ بڑے بڑے اور لمبے شہتوتوں کا ذائقہ لے رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں ایک خواب آلود پانی کے اندر چپوؤں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ میں نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر ایک توری اور بئے کے گھونسلے کو پرے ہٹا دیا۔ مجھے محسوس ہوا، انسان کا ارض و سما کی وسعتوں سے بھی ایک رشتہ ہے۔

پرتھوی بل کے باہر بوادتا اچارج بدستور کرونده اور سنگھاڑے بیچ رہا تھا۔ میں نے میز کے قریب کھڑے ہو کر نفرت سے اپنے جسم پر لگے ہوئے سرخ نشان کو دیکھا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے قلمدان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہاں سے پیسے اٹھا لیے اور سرخ نشان کو پھاڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔

اب میں قرنطین سے باہر تھا۔ وہ سبز خاموش سپاہی، مجھے دیکھ کر مسکراتے تھے۔ میری جرأت کی داد دیتے تھے۔ میرا دل بے پایاں آسمان کی طرح کھل رہا تھا۔

شام کو مجھے بخار ہو گیا۔ میرا دل اور میرا جسم قدرت کی سخاوت کے قابل نہ رہا تھا۔ پھر میرا ضمیر مجھے برابر سرزنش کرتا رہا۔ میری نبض تیز ہو گئی۔ شام کو بابا آئے۔ ان کا چہرہ مجھے ٹیڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ پھر رنگا رنگ نقطے بسیط ہونا شروع ہوئے۔ لیکن ان نقطوں اور جلے ہوئے حلقوں کے درمیان مجھے بابا کی دودھیا سقیہ ڈاڑھی بدستور ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔ میں نے بابا کو بتایا کہ اماں نے مجھے چوری کے الزام میں بہت پیٹا ہے۔ حالانکہ میں نے چوری نہیں کی۔ معاً مجھے یاد آیا، بابا نے بھی اپنی زندگی میں ایک چوری کی تھی۔ لیکن جب انہوں نے چوری کا اقبال دادی اماں کے سامنے کر لیا تھا، اور اس دن اماں جان جو پیسوں کے متعلق پوچھتی رہیں تو میں نے صاف لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اس وقت مجھے بار بار یہی خیال آتا! کاش میں اپنے بابا کی طرح کشادہ دل انسان ہوتا! اور اپنے جرم کا اعتراف کر لیتا۔ اچانک ایک بہت برے درد نے میرے جسم اور ذہن کا احاطہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی پر شفقت ہاتھ میرے سر کی تمام گرمی کو کھینچ رہا ہے۔ میں نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں اور بابا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے

کہا۔

”بابا، آپ کہانی سنائیں“

”کون سی کہانی میرے بیٹے؟“

”جب آپ چھوٹے تھے آپ نے ایک بار چوری کی۔ آپ نے ماں کے سامنے اس بات کو مان لیا جب آپ بہت چھوٹے سے تھے نا؟“

بابا میری ماں کو آواز دیتے ہوئے بولے۔ ”سیتا اِدھر لانا ایک پانی کا گلاس۔۔۔ تم نے نندی کو کیوں پیٹا ہے؟ میں جانتا ہوں وہ کیوں بیمار ہے۔ لاؤ پانی، لاؤ گی بھی؟

پانی کا گلاس لے کر ایک گھونٹ نیچے اتارتے ہوئے بابا بولے۔ ”ہاں نندی! میں نے یہ کہانی تمھیں سنائی تھی۔ میں نے چوری کی تھی اور ماں کے سامنے اس چوری کو مان لیا تھا۔“ اس کے بعد بابا نے ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی۔ اس وقت جب کہ وہ پُر شفقت ہاتھ میری تمام مصیبتوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا، ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور انہوں نے اپنا منھ میرے کان کے قریب کرتے

ہوئے کہا۔ ”سچ یہ ہے میں نے چوری کی تھی۔ جب میں چھوٹا تھا، اور سنو نندی، میرے بیٹے، اٹھ کر کھیلو میں نے آج تک تمھاری دادی کے سامنے اس چوری کا اعتراف نہیں کیا۔“

ایک عورت

ٹاؤن ہال کے سامنے نسیم باغ کے اندر دو تین چیزیں ہی میری توجّہ کا مرکز تھیں۔ ایک لمبا سا سُنبل کا درخت جو بھیگی ہوئی سبز چھال کا ایک خوبصورت کوٹ پہنے تھا اور جو ہَوا میں دور دیہڑھ رام دھن کے قدرتی نشیب سے ایک شرابی کی طرح جھومتا نظر آتا تھا۔ ایک کھلنڈرا احمق سا طالب علم جو اپنی کتابوں کو دور پھینک کر ہمیشہ ایک ہی انگریزی گانا گیا کرتا تھا، جس کا مطلب ہے۔۔۔ جب سردی آتی ہے تو بہار دور نہیں رہتی۔

ان دونوں کے علاوہ بیس بائیس برس کی ایک عورت دکھائی دیا کرتی، جو اپنے لقوہ زدہ بچّہ کے رال سے آلودہ چہرے کو چومتے ہوئے دیوانی ہو جاتی۔ وہ عموماً ایک ہی طرح کی سفید ویل کی سادہ ساڑھی پہنا کرتی، اور اس کے تیوروں کے درمیان کہیں لکھا تھا۔۔۔ پرے ہٹ جاؤ۔

پہلے پہل جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ وہ بھوکی ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی اس نے کچھ مالٹے خریدے اور اپنے بچّے کے سامنے بکھیر دیے۔ اگر وہ بھوکی ہوتی تو ضرور ان مالٹوں میں سے ایک آدھ مالٹا کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھالیتی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ جنسی بھوک کی شکار ہے لیکن اگر میرا یہ خیال درست ہوتا تو اس کے ماتھے پر وہ تیور نہ ہوتے اور وہ نوّے فیصدی عورتوں کی طرح اپنے لیے بھی کوئی شوخ رنگ منتخب کرتی۔

لقوہ زدہ ہونے کے باعث اس کا بچّہ بدصورت تھا اور اس کا چہرہ ہمیشہ رال سے آلودہ ہوتا تھا۔ اس کی ماں بیسیوں دفعہ رُومال سے اس کا منھ اور ٹھوڑی صاف کرتی، لیکن بچّہ ایک احتجاج سے اِدھر اُدھر سر ہلانے لگتا اور صاف کیے جانے کے فوراً بعد ہی لعاب کے بُلبُلے اُڑانے لگتا، جو ہَوا سے بکھرتے ہوئے اس کی ماں اور

اس کے اپنے چہرے پر آ کر گرتے اور ایک عجیب نفرت انگیز کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ ایک بے معنی احمقانہ ہنسی ہنسنے لگتا، اور وہ عورت خوشی سے رونے لگتی۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ایک سیاہ موٹر، جو ہر روز نسیم باغ کے دروازے پر آ کر کھڑا ہوتا ہے اور جس کا ڈرائیور بڑی بدتمیزی سے ہارن کو زور زور سے بجاتا ہے، اسی عورت کو لینے آتا ہے۔ اس کار میں سے ایک لمبا چوڑا مرد ایک چوڑی دار پاجامہ، جس کا ازار بند ململ کی قمیص کے نیچے سے جھانکا کرتا، پہنے آتا۔ اس کی گرگابی کا پینٹ چمڑا بہت چمکتا تھا۔ اس کا منہ پان کی پیک سے بھرا ہوا ہوتا۔ زیادہ قریب ہونے سے اس کی سُرخ آنکھوں اور اس کے سانس کے تعفّن سے اس کے شرابی ہونے کا پتہ چلتا۔ شاید وہی آدمی اس بچّے کے لقوہ زدہ ہونے کا باعث تھا۔ وہ اس عورت کے قریب آ کر اسے بہت گرسنہ نگاہوں سے دیکھا کرتا اور اسے بازو سے پکڑ کر موٹر کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا۔ ان حرکتوں سے وہ اس عورت کا خاوند تو دکھائی دیتا تھا، مگر اس بچّے کا باپ نہیں۔

اپنے خاوند کے بلانے پر بھی وہ عورت اپنے مخصوص دیوانے پن سے اس بچّے

کے ساتھ کھیلتی جاتی اور اس کا خاوند بسا اوقات ایک ٹھنٹھ پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلائے اپنی بیوی کی مجنونانہ حرکتوں کو دیکھتا۔ کچھ عرصہ بعد بیوی ان ہی دور باش نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھتی اور بچے کے چھوٹے موٹے کپڑے، مالٹے، سیلولائڈ کے کھلونے سمیٹنے لگتی۔ اُدھر ہارن کی آواز بلند ہوتی جاتی، ادھر عورت اپنے کام میں تیزی سے منہمک ہو جاتی۔

مجھے اس عورت سے ایک قسم کا اُنس ہو گیا تھا۔ ایک قسم کی دلچسپی، جس کی بنا پر میں اس کی حرکت میں معانی تلاش کر لیتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عورت واقعی خوبصورت تھی یا نہیں، لیکن میرے تخیّل نے اسے بے حد حسین بنالیا تھا۔ اس کا بالوں کو سنوارنے کا انداز مجھے بہت پسند تھا۔ وہ جھٹکے سے اپنے بے ترتیب بالوں کو پیچھے کی طرف پھینک دیتی اور اپنی انگلیاں پھیلا کر شانہ کی طرف ان میں داخل کرتی ہوئی اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف لے جاتی اور میرے لیے یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ اس کی حرکتیں ارادی ہیں یا غیر ارادی۔

مجھے اس کے خاوند کی طرح اس کے بچّے اور اس کے لعاب آلودہ چہرے سے بے حد نفرت تھی۔ البتہ بچّے کی بے چارگی پر رحم بہت آتا، جو میرے دل میں محبت

کے جذبہ کو اکسا دیتا، لیکن اس قسم کی محبت جس کی تہہ میں ہزاروں نفرتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوں۔ اس سے تو محبت نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

بہت دنوں تک میں کسی ایسے موقع کا منتظر رہا جب میں اس عورت سے ہم کلام ہو سکوں، جیسا بازاری محبت میں ہوتا ہے کہ کسی لڑکی کی کوئی چیز گر جاتی ہے اور کوئی لڑکا اُسے اُٹھا کر صاف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"محترمہ۔۔۔ آپ کا رومال یا آپ کی کتاب!"

پھر وہ لڑکی مسکرا کر شکریہ ادا کرتی ہے اور بس محبت شروع ہو جاتی ہے۔ میں بہت دنوں تک دیکھتا رہا کہ اس عورت کی کوئی چیز گرے اور میں کہوں۔۔۔

"محترمہ۔۔۔ آپ کی۔۔۔ آپ کی۔۔۔ آپ کی۔۔۔"

اور پھر محبت شروع ہو جائے۔ مگر وہ عورت بہت محتاط تھی اور اس نے مجھے کوئی ایسا موقع نہ دیا۔ اکثر وہ مجھے ارد گرد منڈلاتے ہوئے دیکھتی، لیکن میں اس کو متوجہ نہ کر سکا۔

آخر اُسے ایک دن مالٹے خریدنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس وقت بچّے کی

جرابیں، ربڑ کی گڑیاں اور کھانے کی چند چیزیں، جن کے آس پاس کوّے منڈلا رہے تھے پڑی تھیں۔ اگر وہ بچے اور ان چیزوں کو چھوڑ کر جاتی تو یقیناً کوّے ان چیزوں کو کھا جاتے اور شاید بچّے کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو ٹھونگ بھی لیتے۔ بچّے میں پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہو رہی تھی اور وہ مالٹوں کا سُرخ رنگ پسند کرتا تھا۔ اس عورت نے کئی مرتبہ اٹھنا چاہا لیکن ان سب باتوں کی وجہ سے وہ اٹھ نہ سکی۔ میں نے موقع پا کر اسے کچھ کہنا چاہا لیکن چند دنوں سے اسے مخاطب کرنے کے لیے جو الفاظ میں نے حفظ کر رکھے تھے، بھول گئے اور میں فقط یہی کہہ سکا۔

"محترمہ۔۔۔! آپ کیا چاہتی ہیں۔۔۔؟"

اور اس عورت کے تیور بدستور قائم رہے، تاکہ اسے میری آنکھوں میں وہی کچھ دکھائی نہ دے جو اسے اپنے خاوند کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے پھر اسی نفرت سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"جی نہیں، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

۔۔۔ اور میری محبت مقفّل پڑی رہی۔

اس عورت کا خاوند مویشیوں کے ہسپتال میں معلّم تھا۔ کم از کم اس کی شکل اور باتوں سے تو یہی پتہ چلتا تھا۔ ہر وقت حیوانوں کے ساتھ رہنے سے اس میں ایک خاص قسم کی حیوانیت پیدا ہو چکی تھی۔ اُسے اپنے لقوہ زدہ بچّے پر کبھی پیار نہیں آتا تھا اور جب اس کی بیوی بچّے کو اس کے بازوؤں میں دھکیلنے کی کوشش کرتی تو وہ گھبراتا ہوا پیچھے ہٹ جاتا۔۔۔ ”ہے ہے! میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ میرے، میرے۔۔۔“

اور پھر وہ ان ہی گرسنہ نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہوا کہتا۔ ”چلو میری جان، شوفر اب بہت شور مچا رہا ہے۔“

اس عورت کا نام دمو تھا۔ خاوند اور بیوی کی باہم گفتگو سے مجھے اس کے نام کا پتہ چل گیا تھا۔ دمو کتنا خوبصورت نام ہے۔ آہستہ سے پکارا جائے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ اور جب دمو ناراض ہو جائے تو یہ نام لے کر اُسے پچکارنے میں کتنا لطف ہے۔۔۔ یا شاید یہ سب کچھ مجھے ہی محسوس ہوتا تھا۔۔۔

ایک دن اس کا خاوند کہہ رہا تھا۔۔۔

”ہمارے اسپتال میں یہی ہوتا ہے۔“

”تو ہوا کرے۔“ دمو نفرت سے بولی ”وہ کوئی انسان تھوڑے ہی ہیں۔۔۔“

”وہ بہتر انسان ہیں۔۔۔“ خاوند نتھنے پھُلاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمھارا خیال ہے کہ ایک گھوڑے کو لنگڑا ہو جانے پر مارنا نہیں چاہیے۔ کیا یہ اچھا ہے کہ اس کا مالک اس سے برابر کام لیتا ہوا اُسے ہر روز چابکوں سے زخمی کرتا رہے؟“

دمو نے بدستور نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا اُسے کھُلا نہیں چھوڑ سکتے؟“

دموں کا خاوند اپنے بیٹے کی طرح احمقانہ ہنسی ہنسنے لگا اور بولا۔

”اس طرح کوئی اسے کھانے کے لیے کچھ نہ دے گا اور وہ بھوکوں مر جائے گا۔ اب یہ فیصلہ تمھارے ہاتھ رہا کہ اس کے ایک دفعہ گولی مار کر اذیّت دینا بھلا ہے، یا اس کا روز روز کا مرنا۔“

دمو لاجواب ہو گئی۔ اس سے لعاب سے بھرے ہوئے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور پھر اسے ایک گہرے مادرانہ جذبہ سے اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا اور بچّہ

خوخو کرتا ہوا خلاء میں ہاتھ پاؤں ہلانے لگا۔ دمو نے اسے اتنا پیار کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ان سب باتوں سے ڈاکٹر کے خوفناک ارادوں سے مطلع ہو چکا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے لیے یہ بات کون سی مشکل ہے۔ وہ دو تین دن تک سب کو کہتا پھرے گا۔۔۔ بچّہ بیمار ہے۔۔۔ اور پھر ایک دن چپکے سے اسے سُلا دے گا۔۔۔ اس وقت بچّہ گھناؤنے انداز میں خوخو کرنے لگا اور اپنے ہاتھ پاؤں موت وحیات کی کشمکش میں اِدھر اُدھر ہلائے گا۔ اس کی ماں جہاں کہیں بھی بیٹھی ہو گی، اُسے اپنے بچّے کی تکلیف کا احساس ہو جائے گا۔ وہ یقیناً اپنے وحشی ہوس راں شرابی خاوند کے اس جرم کو برداشت نہ کر سکے گی۔

اگلے دن میں بینک سے واپسی پر حسبِ معمول سُنبل کے سائے میں پہنچ گیا۔ وہاں وہی طالب علم اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز میں دو گیندوں کو بیک وقت اچھال کر پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی کتابیں ہمیشہ کی طرح بند، قریب کے درخت کے سائے میں پڑی تھیں۔ دمو اپنے بچّے کو لیے موجود تھی اور اپنے بچے کے ساتھ اس کے پیار کی ہر لپٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ گذشتہ دن کی تمام باتیں اس کے ذہن میں محفوظ ہیں اور وہ محبت کی ہر کروٹ کے ساتھ اپنے بچّے کو

زندہ کر لیتی ہے۔

اس وقت وہ بچّہ رینگتا ہوا گاڑی سے کچھ دور سُنبل کے نیچے آ گیا تھا اور سُنبل کے پھیکے بے مزہ پھل کو اپنے دانتوں سے پپول رہا تھا اور اس کی ماں بچّے کو زندگی میں پہلی دفعہ چند قدم رینگتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ میں اس وقت صنوبر کے سائے سے نکلا اور مارکیٹ سے چند قیمتی سُرخ مالٹے خرید کر نسیم باغ کو لوٹ آیا۔ وہ بچّہ ابھی تک سرخ پھل کو پپول رہا تھا۔ میں نے مالٹے اس کی طرف بڑھا دیے اور بچّہ رینگتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ آخر اس نے ایک مالٹا ہاتھ میں تھام لیا، اور میرے ہاتھ سے دوسرا مالٹا لینے کے لیے میری طرف بڑھنے لگا۔ دمو میری طرف متوجہ ہوئی۔۔۔مجھے اس کے چہرے سے اس کے جذبات کا پتہ چل رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی، شاید اس کا بچّہ جسے کل ہی اس کا وحشی شوہر محض اس بناء پر مار ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ ان کی محبت کے راستے میں خلل انداز تھا۔ کسی آسمانی برکت کے نزول سے چلنے لگے۔ اس کے چہرے پر امید و بیم کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔

اگلے دن میں نے بازار سے چند ایک رنگ دار غبارے خریدے اور انہیں دھاگے

سے باندھ کر بچّے کے پاس رکھ دیا اور جب وہ نزدیک آ کر انہیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے دھاگا کھینچنا شروع کر دیا اور غبارے میری طرف سرکنا شروع ہو گئے اور بچہ آہستہ آہستہ رینگتا رینگتا ان غباروں کی طرف بڑھنے لگا۔

دمو نے قریب آتے ہوئے کہا

"دھاگہ کو ذرا آہستہ آہستہ کھینچیے۔"

میں نے دھاگہ کو آہستہ کھینچتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو۔۔۔ اسے ذرا تیز چلنے کی مشق کرنی چاہیے۔"

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی اور اپنی پرانی جگہ، جہاں کہ وہ ہر روز بیٹھا کرتی تھی، واپس چلی گئی۔ پھر آئی اور پھر چلی گئی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں بیٹھ نہیں سکتی۔ کچھ دیر بعد بچے کا لعاب آلودہ فراک بدلنے کی غرض سے وہ پھر چلی آئی اور میں نے کہا۔

"محترمہ۔۔۔! کون جانے اس کا لقوہ بھی اچھا ہو جائے۔"

دمو کا چہرہ چمک اُٹھا۔

کئی روز ایسا ہی ہوتا رہا۔ میں ہر روز بینک سے لوٹتے ہوئے اس بچّے کے لیے کچھ نہ کچھ لے جاتا۔ آخر ایک دن میں نے بہت دیر تک بچّہ کو گود میں اُٹھائے رکھا۔ میں نے اپنی جیب سے رُومال نکال اور اس کا لعاب سے بھرا ہوا منھ پونچھا۔ اس کے بعد میں نے بچّہ کا منھ چوم لیا۔

دمو کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا۔ تھوڑے سے گومگو کے بعد وہ میرے قریب آ گئی اور مسکرانے لگی۔

اس وقت سنبل کا درخت تیز ہَوا کی وجہ سے زور زور سے ہل رہا تھا اور وہ کھلنڈرا طالب علم سرد ہَوا کے جھونکوں سے متاثر ہو کر وہی گیٹ گنگنانے لگا۔

جب سردی آتی ہے تو بہار دور نہیں رہ جاتی۔

اس وقت لقوہ زدہ بچّہ میری گود سے اتر کر ہمارے پاؤں میں رینگنے لگا۔ اور ہم دونوں جانتے تھے کہ اس کا لقوہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

ٹرمینس (آخری اسٹیشن)

جیون۔۔۔ یا بہتر طور پر جیجون دوآبہ اس لائن کا آخری اسٹیشن تھا اور گاڑی اس کی طرف بے تحاشہ بھاگی جا رہی تھی، جس طرح بجھنے سے پہلے شعلے میں ایک لپک پیدا ہوتی ہے، اسی طرح گاڑی کی رفتار میں بھی ایک لپک سی پیدا ہو رہی تھی۔ دائیں اور بائیں شوالک کے سلسلے دو لمبے لمبے بازوؤں کی صورت کھل رہے تھے، اور اس وسیع و عریض آغوش کے اندر چھوٹے چھوٹے ٹیلے، گینگ ہٹ، آم، جھاڑیاں، جھونپڑیاں، گاڑی کے آخری چھکڑے کو پکڑنے کے لیے پیچھے کی

طرف بھاگ رہی تھیں۔ دور کہیں پٹھو اور مویشی گو پھیے میں پڑے ہوئے کنکروں کی مانند ایک بہت بڑے دائرے میں گھومتے دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت بارش تھمی ہوئی تھی، لیکن کچنال اور آم کے پیڑوں کی سیاہ چھال سے اندازہ ہوتا تھا کہ دن اور رات کے چار پہروں میں چھاجوں ہی پانی پڑ گیا ہے۔ سورج، برساتی شام کے شوخ و شنگ رنگوں کے درمیان بادل کے ایک ٹکڑے میں الجھا ہوا پریشان نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کتنی کہر تھی اور سیل، جسے اس نے اُٹھار کھا تھا۔ پانی زمین پر کہیں کم تھا اور کہیں زیادہ۔ ہوا ساکن تھی اور گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان زمین کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہے۔

کبھی آنِ واحد میں یوں محسوس ہونے لگتا، جیسے باہر دکھائی دینے والا ہر ایک نظّارہ ہمارے ہی کسی اندرونی منظر کا عکسِ کثیف ہے۔۔۔ جے رام اُداس تھا اور اسے فضا میں مغمومیت دکھائی دیتی تھی۔ وہ گاڑی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا بے کلی سے جیحون دوآبہ ٹرمینس کا انتظار کر رہا تھا۔ کبھی وہ درد سے اپنی سیٹ پر اچھل جاتا اور کبھی سامنے چوٹیوں پر دھندلی سی دکھائی دینے والی برف کو دیکھ کر اس کی

انگلیاں، اس کے سفید بالوں میں دھنس جاتیں اور وہ سوچتا۔۔۔ جس طرح گاڑی ایک لپک کے ساتھ اپنے مقامِ آخر کی طرف بھاگی جارہی ہے، شاید میں بھی اپنے مقامِ آخر کی طرف لپکا جارہا ہوں۔ یکایک اس نے مقابل کی نشست پر پڑی ہوئی مائی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"بھولی مائی! اُٹھ دیکھ! تیرا جیجون آرہا ہے۔"

مائی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا جلال، جو ایک چالیس سالہ رنڈاپے اور لاولدی کا شاخسانہ تھا اور جو کسی ناخوشگوار خواب کی وجہ سے مدھم ہو گیا تھا، عود کر آیا اور وہ ایک بچی کی طرح خوش ہو کر بولی۔ "آگیا جیجون۔۔۔ بس یہاں سے سات کوس پرے رہیں میری بیٹی اور جنوائی۔۔۔ میری سیتارام کی جوڑی!"

باہر سے ایک ننھی سی کنکری اُڑی اور جے رام کی آنکھ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر کے لیے اس کی آنکھیں اندر کی طرف سمٹ گئیں۔ پُتلیاں قدرے پھیلیں اور حقیقتِ حال کی خلش کے باوجود اسے گزرے وقت کے ڈراؤنے خواب دکھائی دیے۔ زرد رو، جفاکش، شکست آشنا جے رام نے اپنے ماضی میں جھانکا تو اسے اپنے بے کیف پچاس برسوں میں ایک حیات افروز لمحہ نظر آیا۔ اس وقت جب

کہ جے رام زندگی کی بیسویں خزاں دیکھ رہا تھا، کرتار پور اسٹیشن کے پیاؤ پر ایک لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مُسکرائی اور کئی دن جے رام کی عقل و حیا محبت کے گو پھیے میں پڑی رہی!

ایک دھکا سا لگا اور قریب کے شور و غل سے پتہ چلا کہ گاڑی جیجون دوآبہ ٹرمینس کے احاطے میں داخل ہو کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بھولی مائی اور اس کے ساتھ دوسرے مسافر اُترے اور باہر نکلنے کے لیے پھاٹک کی طرف بڑھے۔۔۔ اس وقت شام لمحوں کی سولی پر تڑپ رہی تھی، اور سیاہی کی لمبی لمبی لٹیں اونچے کھمبوں، پل اور شیڈ کی مدد سے دن کے شانوں پہ بکھر رہی تھیں۔ جے رام بھی غم اور کپڑوں کی گٹھڑیاں اُٹھائے پھاٹک کی طرف بڑھا، لیکن رُک گیا۔ اس وقت ٹھٹھر گاؤں جانے کا اسے سمبندھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

معاً جے رام کو ایک ایسا خیال آیا، جو اس نے سفر سے پہلے سوچا ہی نہ تھ۔۔۔ اسے اب ٹھٹھر گاؤں میں پہچانے گا کون؟ وہ کٹھون کے ایک پُرانے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن کھٹ کچھ تو جیجون اور کچھ ہوشیار پور اور اس کے نواح میں آباد ہو گئے تھے، اور اپنے پیڑوں کی وجہ سے جیجون میں ایک خاص شہرت کے

مالک تھے۔ ٹھٹھر میں صرف ایک تایا باپو کی خبر ملتی تھی، لیکن وہ تو جے رام کے بچپن ہی میں ضعیفی اور جھکی ہوئی کمر سے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے قبر تلاش کر رہے ہوں۔ اس وقت ان کا موجود ہونا ایک ناممکن سی بات تھی۔ ان کے چار پانچ لڑکیاں تھیں، جو ایک ساتھ شادی کے بعد سنتوکھ گڑھ، اونہ، گڑھ شنکر اور اس کے نواح میں اس طرح بکھر گئی تھیں جیسے آتشیں انار کی چنگاریاں چھوٹتے ہی چاروں طرف بکھر جاتی ہیں، اور جے رام پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے بنچ کی طرف لوٹا اور مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جیون دوآبہ ایک خاصا بڑا اسٹیشن تھا۔ کبھی جیون ایک بڑی منڈی ہوا کرتی تھی، جس کے لیے اسٹیشن پر ایک یارڈ تعمیر کیا گیا تھا، جو ان دنوں سونا پڑا تھا۔ لائن پر بچھانے کے لیے پتھر تو ابھی تک بھیجے جا رہے تھے۔ سائیڈنگ میں بڑا سا کرین یکّہ و تنہا، بیکار و بے مصرف کھڑا دور سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مرغ ہے جسے بھوننے کے لیے اس کے بال و پر نوچ لیے گئے ہوں۔ اس کرین سے پیچھے ہٹ کر دو مال گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے چھتوں کے نہ ہونے سے ان میں پتھر اور بارش کا پانی پڑا تھا۔ سائیڈنگ کے شمال کی طرف ریل پر چند ٹھوکریں تھیں۔

ایک ٹھوکر باقیوں کے بہ نسبت کافی فاصلہ پر تھی اور یہ دور صرف اس لیے بنائی گئی تھی، کہ انجن کو شنٹ کرنے میں آسانی رہے، یا اگر گاڑی تیزی و تندی میں آگے نکل جائے تو اسے پٹری پر سے اترنے یا ٹکرانے کا خطرہ نہ رہے۔ اور لوہے کی یہ بڑی بڑی اور مضبوط ٹھوکریں جے رام کو ہراساں کرنے لگیں۔ جے رام نے سوچا، کاش یہ ریلیں ایک دم ان ٹھوکروں پر رُک جانے کے بجائے سامنے دکھائی دینے والی پہاڑی میں گم ہو جائیں۔

جے رام نے اُٹھ کر اپنے جسم کو ایک بوسیدہ اور پیوند لگے کمبل میں اچھی طرح سے لپیٹا اور ایک نہایت مشتبہ انداز میں اسٹیشن کے جنگلے کے ساتھ ساتھ گھومنے لگا۔ جنگلے کے قریب اندھے کنوئیں پر پیپل کا ایک تنہ بڑھا ہوا تھا اور ایک لنگور اپنی لمبی سی دُم کو تنے پر بل دے کر کنوئیں میں اوندھا لٹکا ہوا تھا۔ اس کالے کلوٹے چہرے میں دو بھوری سی آنکھیں راکھ میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ گھاٹیوں کے پیچھے پانی بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا اور اس برساتی نالے کے شور میں جیحون کے قصبے کا سب شور ڈوب رہا تھا۔ اسٹیشن کی فضا خاموش اور افسردہ تھی۔ جدھر سے جے رام آیا تھا، اُدھر لائنوں کا ایک جال بچھا

ہوا تھا۔ ایک بڑے جنکشن اسٹیشن پر ہی کم از کم اتنی لائینیں تھیں جتنی جے رام کے جسم میں شریانیں اور وریدیں اور وہاں سینکڑوں ہی خلاصی، قلی اور یارڈ مین تھے، جو آتی جاتی گاڑیوں کے درمیان بے کھٹکے، مطلب بے مطلب گھوما کرتے۔ کبھی کبھار کوئی انجن آناً فاناً دندناتا ہوا شیڈ کے دوزخ سے سُرمہ اڑاتا ہوا کسی کو جھپٹ میں لے لیتا۔ لیکن صبح سے پہلے کوئی اور مائی کالال اس کی جگہ پُر کرنے کے لیے آ دھمکتا اور جے رام نے سوچا یہاں جیجون کی کسی سُونی لائن پر کوئی بے کھٹکے سر رکھے اور سو رہے۔

جب سے جے رام آیا تھا، کسی نے ٹکٹ بھی تو نہیں پوچھا۔ ایک صاحب جو انداز سے اسٹیشن ماسٹر اور کپڑوں سے حجام معلوم ہوتے تھے، کُرتا اور تہمد پہنے، ہاتھ میں ناریل سنبھالے، کھڑاؤں سے کھٹ کھٹ کرتے ایک ٹوٹے ہوئے لیمپ کے ستون کے قریب کھڑے ہو کر کانٹے والوں کو بے تحاشہ صلواتیں سُنا رہے تھے۔ کانٹے بدستور گالیوں سے بے اعتنائی، دُور کھڑے سبز اور سُرخ بتیوں کی پریڈ کر رہے تھے۔ اسٹیشن کے اسٹاف نے یہاں وردی پہننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ کہیں برس میں ایک آدھ بار ٹریفک انسپکٹر آ نکلتا تو اس کا حصّہ چپکے

سے ہاتھ میں تھما دیا جاتا اور پھر اُسے دھوتی کُرتے میں ہی سرج دکھائی دینے لگتی۔ بہتا ہوتا تو وہ بڑے مشفقانہ انداز میں اسٹیشن ماسٹر سے کہہ دیتا۔۔۔

"مر جاؤگے مادھولال۔۔۔ مر جاؤگے سردی میں تم لوگ!"

انسپکٹر پیسوں کی حدّت اور اسٹیشن ماسٹر جیجون کی سردی سے کسی قدر آشنا ہو گیا تھا، "مر جاؤگے تم لوگ" کا جواب ایک مختصر "ہونہہ" کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ جے رام گھوم پھر کر پھر اندھے کنوئیں کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس کی تہہ میں ٹوٹے ہوئے ڈھکنے، قمچیاں، پیپل کے پتّے، پتھر اور پانی کو دیکھنے لگا۔ لنگور اس وقت تک کہیں بھاگ گیا تھا۔ اس کی جگہ چند چھوٹے چھوٹے بندر قلابازیاں لگانے لگے۔ ایک ننھّا سا بندر اپنی ماں کے پیٹ کے ساتھ چمٹا ہوا نیچے گویا موت کو دیکھ کر منھ چڑا رہا تھا۔ جے رام نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر زندگی کی اس لغو نقل کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ لیکن وہ اس کارِ خیر کے لیے بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ جیسے اوپر بندر کا بچّہ موت کا منھ چڑا رہا تھا، اسی طرح موت جے رام کا منھ چڑا رہی تھی۔

دُور گھاٹیوں پر چند روشنیاں ایک سمت کو جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ جے رام اس تیس برس کے عرصہ میں بہت کچھ بھول چکا تھا۔ لیکن اسے یہ نظارہ کچھ مانوس سا

معلوم ہوا۔ جنگلے سے پرے ہٹتے ہوئے وہ اسٹیشن ماسٹر کے قریب پہنچتے ہوئے بولا۔

"یہ روشنیاں کیسی ہیں بابو؟"

اسٹیشن ماسٹر نے مونچھوں کا ایک بڑا سا فلِٹر اُٹھایا اور ایک بھدّی سی آواز میں بولا۔ "یہ لوگ گاؤں جارہے ہیں۔"

"کون گاؤں میں؟"

"یہی ٹھٹھر۔۔۔ سنتوکھ گڑھ بگیرہ۔"

جے رام خاموش ہو گیا۔ اس خیال سے اُسے ایک گونہ تسلی ہوئی کہ جیجون دوآبے سے پرے بھی ہزاروں پگڈنڈیاں شوالک کے گرد بل کھاتی چلی جاتی ہیں، جس طرح تناسخ کے پہلے طالب علم کو موت کے دروازے میں سے جھانکنے پر اپنی ہی سینکڑوں شبیہیں دکھائی دی تھیں، اور حیات و ممات اسے صرف ایک کھیل سا نظر آیا تھا، اس طرح ان پگڈنڈیوں کو دیکھ کر جسم و روح میں لرزہ پیدا کر دینے والی ریلوں کی ٹھوکریں جے رام کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔

جیحون دوآبہ ایک برانچ لائن کاٹر مینس ہو تو ہو، لیکن انسانی قدموں سے بنی ہوئی پگڈنڈیوں کا اختتام نہیں۔

اسٹیشن ماسٹر نے پھر مونچھیں اٹھائیں اور بولا۔

"تم کون ہو؟"

جے رام نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔

"میں کون ہو؟۔۔۔ میں ایک مسافر ہوں بابا۔"

مسافر کا لفظ ہم شکست پسندوں کی لغت میں ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ ایک خاص انداز میں "مسافر" کہنے سے دو سننے والے ایک ہی دُنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ٹکٹ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اور اس بے حد جذباتی اور روایات کا منظر لیے ہوئے لفظ سے، گفتگو اور ہی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر، جس کے پردادا کو لقوہ کی شکایت تھی، کچھ تتلایا۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ ران پر مارا۔ اور پھر ایک لمبی سرد آہ بھرنے کے بعد انجن کی طرح بھاپ چھوڑتے ہوئے بولا۔

''ہو بابا۔۔۔ ہر شے مسافر ہر چیز راہی!''

اور پھر ٹر مینس اسٹیشن والوں کے لیے مسافر کا لفظ ایک خاص وسعت اور حدود رکھتا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے ایک فرسودہ سا مصرعہ دُہرایا۔

''اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے۔''

اور یہ مصرعہ اسٹیشن ماسٹر نے کسی شاعر کے دیوان کی بجائے لاری کے ایک تختے پر خدا کے ہندو، سکھ اور مسلم ناموں کے درمیان مقیّد اور محفوظ پڑھا تھا اور شرابی ڈرائیور کی ہر ممکن غلطی اور ٹھرّے کا جواز تھا۔ یکا یک اسٹیشن ماسٹر کو پتہ چلا کہ اس مصرعے کے پڑھنے سے وہ یکلخت اپنی جیورس ڈکشن سے پرے، ذلیل لاریوں اور پرندوں کی دنیا میں چلا گیا ہے۔ اس نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے سورداس کی ایک چوپائی پڑھی اور بولا۔

''ہو بابا۔۔۔ یہ دنیا مسافر خانہ ہے۔۔۔ ہر ایک کو آنا جانا ہے۔۔۔ یہ سنسار متھیا مایہ ہے۔۔۔ کوئی اپنا ہے نہ پرایا ہے۔۔۔''

اس بات کے بعد جے رام نے اپنے آپ کو اسٹیشن ماسٹر کے بہت قریب محسوس کیا اور وہ اس کے پاس لاٹھی ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس زمین میں کچھ دیر طبع آزمائی کرنے کے بعد رسمیات میں داخلہ ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

"آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟"

جے رام نے مسکراتے ہوئے اپنی کرم خوردہ بتیسی دکھائی اور اپنے مذہبی اور ملّی انکسار سے بولے۔ "میرا غریب خانہ ٹھٹھر ہے۔۔۔ اور آپ کا؟"

"میں ہمیرپوریا ٹھاکر ہوں۔۔۔"

"بندہ" کی جگہ "میں" کا لفظ آ جانے سے جے رام کو اچنبھا ہوا۔ لیکن اسٹیشن ماسٹر سچّا تھا۔ ٹھاکر بندے نہیں ہوتے۔ یہ تو بہت کیا کہ وہ "میں" ہو گئے، ورنہ "ہم" سے ورے کوئی صیغہ استعمال نہیں کرتے۔ جے رام کچھ جھینپ گیا۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ ٹھاکر ٹھٹھر گاؤں کے داماد بھی ہیں اور اگر مصلحت اپنے بے ہنگم پن کی بنا پر گدھے کے سے ناقابلِ قبول جانور کو اپنا باپ بنا لیتی ہے، تو ایک نوع سے اسٹیشن ماسٹر کو اپنا داماد متصور کر لینے سے کون سا گناہ ہوتا ہے۔ جے رام نے

باچھیں کھلاتے ہوئے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔

"ہو ٹھاکرے۔۔۔ !ٹھاکروں کے ہاں ہمارے ٹھٹھر کی بھی ایک لڑکی ہے۔"

"ہاں ہاں۔" اسٹیشن ماسٹر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "میرے بڑے بھائی کی بیوی ٹھٹھرانی ہے۔"

جے رام لاٹھی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کمبل میں اپنے بازو پھیلا دیے، اور یوں دکھائی دینے لگا، جیسے کوئی گدھ پرواز کرنے لگی ہو۔ آنکھوں کو سیکڑ کر اس نے ایک مرتبہ پھر اسٹیشن ماسٹر کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔

"تم کیدارے کے چھوٹے بھائی ہو؟ بجّوباورے۔۔۔ ہے ہے ہے بجّوباورے۔۔۔" اور جے رام پھر ہنسنے لگا۔

اسٹیشن ماسٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا، جیسے کوئی آناً فاناً ننگا ہو جانے پر اِدھر اُدھر دیکھا کرتا ہے۔ ایک مسافر قریب ہی کھڑا اس عجیب و غریب نام کو سُن کر مسکرا رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے راز داری میں جے رام کو آنکھ ماردی اور سر کو ایک جھٹکا دیا۔ گویا کہہ رہا ہو "ہوں تو بجّو باورا، لیکن یار چپ رہو۔ یہاں ذرا عزّت بنی ہوئی

ہے اور مادھولال کے نام کے سوا مجھے اور کوئی کسی نام سے نہیں جانتا۔" جے رام نے دونوں ہاتھوں میں اسٹیشن ماسٹر کا ہاتھ بھینچ لیا اور بازو گویا کلول کے لیے اس کے گلے میں ڈال دیے اور نسبتاً اونچی آواز میں بولا۔ "چھوڑو یارو۔ لوگوں کے لیے تم ہو گے مادھو وادھو۔ پر جے رام کھٹ کے لیے تم بجّو باورے ہو۔ اُف!۔۔۔ اُف! کتنی دیر کے بعد تمھیں پایا ہے اور یہ نام ہم نے بھارت ورش کے پرسدھ گویّے کے نام پر تمھیں دیا تھا۔ یاد ہے تم نے ٹیکرے چنت پورنی پر ایک بہت ہی بھدّی آواز میں مالکونس کی دھن الاپی تھی، تب سے۔۔۔ ہو ہو۔۔۔۔"

اسٹیشن ماسٹر کو سب کچھ یاد تھا، لیکن وہ اُسے بھولنا ہی قرینِ مصلحت سمجھتا تھا۔ اس وقت بندر نے ایک زقند لگائی اور مادھولال کے کندھے پر آبیٹھا۔ مادھولال نے متوجہ ہوئے بغیر ایک خفیف سی بھَوں چڑھائی اور اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

جے رام بولا "بجّو باورے! تمھارے ہاں کتنے بندر ہیں؟"

"کبھی بہت تھے۔ اب تو روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔" مادھولال نے جواب دیا اور ایک معلوماتی بات سُنانے کا فخر حاصل کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بندر بہت مفید جانور ہے۔ سنتے ہیں کوئی ڈاکٹر وارنوف ہے، جس کے تجربوں کے لیے یہاں

کے بندر پکڑ کر لے جائے جارہے ہیں۔"

"ڈاکٹر وارنوف؟"

"ہاں۔"

"کوئی روسی ڈاکٹر ہے؟"

"ہاں۔۔۔"

"کیا کرتا ہے وہ بندروں کا؟"

شُتر کینہ صفت مادھو لال نے اسی دم بجّو باورے کا بدلہ چکاتے ہوئے کہا "جب کوئی شخص تم سا بوڑھا ہو جاتا ہے اور کسی قابل نہیں رہتا، تو اس میں بندروں کے غدود شامل کر دیتے ہیں۔ پھر وہ نئے سرے جوان بن جاتا ہے۔۔۔"

شاید جے رام کے ذہن میں شہر کا کوئی اشتہاری مضمون چکّر لگانے لگا۔ "یہ سائنس بھی کیا واہی تباہی ہے۔" جے رام نے کہا اور مسکرا دیا۔ مرد اپنی قوّت کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات برداشت نہیں کرتا، اس لیے جے رام نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ان سفید بالوں سے بڈھا نہ سمجھ لینا بجّو باورے!"

اور دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ جے رام بولا ”اِن غدودوں سے بندر کی سی پھُرتی بھی پیدا ہو جاتی ہو گی؟“

”یہ تو نہیں کہہ سکتے۔“ مادھو لال بولا۔ ”لیکن بھائی یہ تجربہ خوب ہے ڈاکٹر وارنوف کا اور اسے اپنے تجربے کے لیے بندر بھی ہردوار، چنت پوری وغیرہ سے ہی ملتے ہیں۔ یہ لوگ آئینہ میں اپنا منہ دیکھتے، ورنہ اُنہیں ہندستان کا رُخ نہ کرنا پڑتا۔ اب چند برسوں سے یہ بندر پکڑے جا رہے ہیں۔ وقت آئے گا یہاں ایک بھی نہ ہو گا اور سچ پوچھیے تو مہابیر کی مورتیاں اب بھی کم دکھائی دیتی ہیں۔ اسٹیشن کے چار بابوؤں، پانچ خلاصیوں، جیحون کے پجاریوں اور مہابیر دل والوں نے ایک میموریل وائسرائے کو بذریعہ تار بھیجا ہے۔ لیکن دوست! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا، میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔ شکل بہت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ کہیں خفیہ پولیس مین تو نہیں؟“

”ہو ہو ہو۔۔۔“

جے رام نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”میں آتوکھٹ کا بیٹا ہوں۔ منجھلا بیٹا ۔۔۔ پہچانا۔۔؟ جس کا بڑا اور چھوٹا بھائی دونوں لاہور کے پاگل خانے میں ہیں۔“

اس معمولی سے اشارے سے مادھولال کو سب کچھ یاد آ گیا۔ ہماری دُنیا ہوشیاروں کی نسبت پاگلوں کو زیادہ یاد رکھتی ہے اور زندہ لوگوں کی بہ نسبت مرے ہوئے لوگوں کے گناہ فوراً بخش دیتی ہے۔ مادھولال بولا۔

”میں آتوکھٹ کے سب بیٹوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔۔۔ بچپن میں ہم نے ایسی شرارتیں کی ہیں جن کی یاد آتی ہے تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے۔ لیکن وہ بچپنا تھا نہ آخر۔۔۔ کہو، تم اتنے دنوں رہے کدھر؟“

اس وقت اندھیرا پوری طرح اپنا تسلّط جما چکا تھا۔ آسمان پر ستارے اور شیڈ میں چمگادڑ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے تھک چکے تھے۔ اور املی کے درختوں میں اپنے گھروندے یا لوہے کے کسی گارڈر کے ایک کنارے لٹک گئے تھے۔ ٹھٹھر جانے والی روشنیاں ایک کہکشاں سا بن گئی تھیں۔ جے رام نے حکیمانہ انداز میں اپنی ٹھوڑی تھامتے ہوئے کہا۔

”میری کیا پوچھتے ہو بابا! بہت سے کھیل کھیلے ہیں، بہت چوٹیں کھائی ہیں، اب آخر میں ایک بڑے وکیل کا منشی تھا۔ اس سے پہلے عدالت میں ریڈر تھا۔ یہ قانون تو میری انگلیوں کی پوروں میں ہے۔“

”یہ بات ہے۔“ مادھو لال نے مصافحہ کے لیے ہاتھ پھینکتے ہوئے کہا۔ ”میرا ایک عزیز تین سو دو (۳۰۲) میں دھر لیا گیا ہے۔۔۔ آٹو۔۔۔ کیا نام ہے تمھارا؟“

”جے رام!“

”جے رام!۔۔۔ اچھا تم اپنی کہہ لو۔ پھر میں اس مقدمہ کی کہوں گا۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ تم کہو۔“ جے رام نے مادھو کو تھپکتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی بولنے لگا۔ ”کسی کے سامنے اپنی مونچھ نیچی نہیں ہونے دی۔ یہ اپنا دھرم نہیں۔۔۔ اور نہیں تو آج ایک پورے ضلع کا مجسٹریٹ ہوتا۔“

مادھو لال نے پلٹ کر اپنے سامنے بظاہر ایک رذیل آدمی کو دیکھا، جو اپنی لاٹھی سے زمین پر حلقے بنا رہا تھا اور تیکھی اور مسلسل نظر سے اسے گھور رہا تھا۔ اس نظر کی تاب نہ لاتے ہوئے مادھو لال نے منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس بہ ظاہر

رذیل آدمی کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ قائل ہوتے ہی بنتی تھی۔ جے رام نے ایک سرد آہ بھری اور ناک کے رقیق لعاب کو کمبل کے ایک کونے سے پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔

"لادی کا بیل جب بھاگے گا، گھوم پھر کر لادی کے پاس آ کھڑا ہو گا۔ بڑے منصف سے لڑائی ہوئی تو ریڈری چھوڑ کر وکیل کا منشی ہو گیا۔ یہ میرا آخری پیشہ ہے، اس سے پہلے میں بیس پیشے اختیار کر چکا ہوں۔"

مادھولال نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بھوک تو لگی ہو گی جے رام۔"

جے رام نے پیٹ پر ہاتھ مارا اور بولا "ہاں، ہے تو۔۔۔ بھوک سے ناف کے نیچے ایک کھلبلی مچی ہوئی ہے اور یوں ڈکار آ رہے ہیں، جیسے برسوں کے لیے کھا لیا ہے۔"

"اچھّا تو چلتے ہیں۔۔۔ چلو۔۔۔" اور مادھولال نے اپنے پوربی خلاصی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "اے سکھوئی۔ بندریا کے نندوئی۔"

ایک کالا سیاہ آدمی، جس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں، قریب آنے

لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اندھے کنوئیں پر وہی لٹک رہا تھا۔ اور یوں بھی لنگور، بندریا کا ننداوئی ہوتا ہے۔ سکھوئی لیمپ روم سے ہاتھ میں مٹی کے تیل اور راکھ سے آلودا ایک چیتھڑا لیے ہوئے آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"کیا حکم ہے سرکار؟"

"دیکھو، لالہ کی گٹھڑیاں اٹھالو۔ پھینک دو اِس چیتھڑے کو؟"

سکھوئی نے ایک گٹھڑی اٹھائی۔ غم کی گٹھڑی۔ مادھولال نے کم از کم وقتی طور پر اٹھالی تھی اور جے رام کچھ سبک سا محسوس کرتا ہوا ساتھ ہو لیا۔ راستے میں بہت دیر خموشی رہی۔ کبھی کبھی اندھیرے میں پتھّروں سے ٹھوکر کھانے پر "اوہ" کی آواز پیدا ہوتی۔ آخر جے رام بولا۔۔۔

"دراصل میں دُنیا سے بہت اُچاٹ ہوں باورے! بہت اُچاٹ ہوں۔ اس لیے میں اِدھر بھاگ آیا ہوں۔ میں نے بہت دولت برباد کی ہے، لیکن کچھ بن نہیں سکا ہے۔ میری طبیعت میں چند ایسے مستقل نقص پیدا ہو گئے ہیں، جنہیں میں کوشش کے باوجود ٹھیک نہیں کر سکا۔"

مادھولال سنتا گیا۔ جے رام بولتا گیا۔ ایک مقدس گرنتھ میں لکھا ہے۔۔۔ ”کتنے ہی جوبن ہیں جو محبت کے بغیر مرجھا گئے ہیں“ اور دراصل میری عادتوں، میری سب بے اعتدالیوں، میرے نشے، میرے تلوّن سب کا کارن یہی ہے کہ میرے ساتھ کسی نے محبت نہیں کی۔ میں نہیں جانتا، آج تک نہیں جانتا محبت کسے کہتے ہیں۔ کرتار پور میں تیس سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا تھا۔۔۔ ایک نوجوان لڑکی میری طرف دیکھ کر مُسکرائی تھی۔ لیکن چھوڑو اس بات کو باورے۔ اب تک تو وہ آٹھ دس بچّوں کی ماں ہو چکی ہو گی۔۔۔ اور کیا معلوم وہ اب کرتار پور میں ہو بھی یا نہیں۔“

اس سال لامحدود فضا میں چند خاکے پیدا ہونے شروع ہوئے اور سکھوئی خود بخود ایک جگہ پر جا کر رُک گیا۔ یہ کمرہ پتھروں سے بنے ہوئے ایک خوبصورت کوارٹر کا ذیلی حصّہ، اس کا ضمیمہ محض تھا، جس کا ایک دروازہ غائب تھا۔ دوسرا دروازہ کھُلنے پر میل اور مٹّی کا تعفّن باہر کی طرف لپکا۔ اس کمرے کا اندر ایک اور دروازہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرہ میں کھلتا تھا۔ جس کی درز میں سے روشنی کی ایک گھٹی ہوئی کرن کمرے کے خاکی ذرّات کو تیرتے ہوئے دکھا رہی تھی۔ دوسری طرف سے

باورے کی نوجوان لڑکیوں کی غٹر غوں بھی سُنائی دے رہی تھی۔ کمرے کے ایک طرف پیال بچھی ہوئی تھی۔ یہاں مادھولال اپنی گائے باندھا کرتا تھا، جو اِن دنوں بیانے کے لیے باہر بھیج دی گئی تھی۔ سکھوئی نے اشارہ پاکر جے رام کا بستر پیال پر پٹک دیا اور جے رام بستر کھولنے لگا۔

جے رام کے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی۔ کاش! اُسے بھی گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا اور ادھر کسی نرم و گرم کونے میں جگہ دی جاتی۔ لیکن مہمان نوازی بھی مرتبے کے تلوے چاٹتی ہے، اور وہ خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا اور کھاٹ آ گئی۔ جے رام کو اپنی حالت پر رحم آنے لگا۔ اس کے تخیّل میں رفعت تھی، جس نے پیال کی دنیا کا خلا پاٹ دیا تھا۔ باورے نے بھی کھانا کھایا اور ڈکار لیتے ہوئے بولا۔ ’’بس دال پھُلکا ہی ہے۔‘‘ جس کا مطلب تھا کہ اس کے اہتمام کا بار بار تذکرہ کیا جائے اور مزید برآں شکریہ بھی ادا ہو۔ لیکن تحسین و شکریہ میں جے رام نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ باورا اور بھی زیادہ منکسرانہ لہجہ میں بولا۔۔۔ ’’بس تمھارے پاؤں کی خیریت پرماتمانے سبھی کچھ دیا ہے۔ دودھ ہے، پوت ہے، بھاگوان بیوی ہے۔۔۔‘‘

جے رام کو یہ بات خوش نہیں کر سکتی تھی۔ اسے زندگی میں یہ سب نعمتیں یا تو میسّر ہی نہیں آئی تھیں اور جو میسّر آئیں، وہ وفا نہ کر سکیں۔ وہ دوسروں کی خوشی میں خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس نے ڈبیہ نکال کر کچھ پھانکا اور اپنی بے چینی کے نکاس کے لیے بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولا۔

"کچھ روز گار کی کہو باورے۔۔۔"

شاید اگر مادھو لال مقروض ہوتا تو اس کے دل کو ایک نوع کی خوشی ہوتی، لیکن مادھو لال بولا۔ "میں یہاں اے کلاس کا اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ چند مہینوں میں بی کلاس کا ہو جاؤں گا اور ایک بڑا جنکشن اسٹیشن ملے گا۔ یہاں قریب ہی ایک اسٹیشن کے لیے کوشش کر رہا ہوں جہاں سے سارے پنجاب میں سلیپر جاتے ہیں اور مونگ پھلی۔ فی سلیپر چار آنے اور فی بوری مونگ پھلی دو آنے ملتے ہیں۔

جے رام نے گھبرا کر بات کاٹ دی۔ "ابھی تمھاری نوکری کافی ہو گی۔"

مادھو لال بولا۔ "ابھی بہت کافی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ریٹائر ہونے سے پہلے میں سی کلاس کے اسٹیشن پر قائم مقام اسٹیشن ماسٹر تو ہو سکوں گا۔"

اس کے بعد مادھولال اٹھ کر چلا گیا۔ جے رام کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ پہلے ہی اپنا منھ چھپانے کے لیے بستر ٹٹول رہا تھا۔ سونے کی کوشش کے باوجود جے رام کو نیند نہ آئی۔ اُسے مادھولال سے حسد پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دنیا، اس بیل کی مانند دکھائی دینے لگی جو بڑے سے درخت پر چڑھتی ہے، بڑھتی ہے لیکن پُروایا، پچھوایا کے پہلے ہی جھونکے پر سڑ جاتی ہے۔

گیلی پیال کی سڑاند سے جے رام بہت بیزار ہوا۔ صبح سویرے کچھ آنکھ لگی، تو مرغیوں کی غٹر غوں نے اُسے جگا دیا۔ جے رام اٹھا اور اس نے دروازے کے قریب ہو کر باہر جھانکا۔ دور کرین پتھروں کا دانہ دنکا چگ رہا تھا اور اس کے ارد گرد مزدوریوں چمٹے ہوئے تھے جیسے پُر مغز ہڈی کے ارد گرد چیونٹیاں چمٹ جاتی ہیں۔ کچھ بندر گھنے پیپل سے مسافر خانے کی چھت پر اتر آئے اور اسے وارنوف کی تجربہ گاہ بنا دیا تھا۔ نیچے مسافر، اسٹیشن کے اندر داخل ہونے کے لیے ایک دوسرے میں اُلجھ رہے تھے۔ حالانکہ کوئی خاص بھیڑ نہ تھی، لیکن یہ افراتفری مسافروں کی زندگی کا ایک جزو بن چکی تھی۔ باہر نکلتے تھے تو افراتفری دکھاتے تھے اور اندر آتے تو سراسیمگی کا اظہار کرتے۔۔۔! مادھولال کے سامنے ہی کسی

نے ایک گنوار کو دھکّے دے کر چند لاتیں اور گھونسے رسید کیے۔ لیکن وہ شخص پھر سے صافہ باندھ آنکھیں جھپکاتا ہوا اسی جگہ آ کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔"

جے رام کے دل میں پھر باورے کی مطمئن دُنیا اور اس کا شاندار مستقبل پیدا ہوا گیا۔ ایک دم حبس سا محسوس کرتے ہوئے جے رام اُٹھا اور اپنے کپڑے لتّے سمیت باہر نکل آیا۔ اس جلدی میں اس نے اپنے میزبان کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔

باہر نکل کر وہ چند غلیظ اور تندرست پٹھوؤں کے پاس پہنچا اور بولا۔۔۔ "کیوں بھائی ٹھٹھر چلو گے؟"

پانچ چھ پٹھو جے رام کے بوجھ کے لیے دوڑے اور پھر ایک ساتھ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے آپس میں لڑنے لگے، لیکن اور ایک آدمی ٹھٹھر جانے کے لیے دکھائی دیا تو سب کے سب جے رام کا بوجھ رکھ کر اس کی طرف بھاگے اور پھر وہاں بھی وہی ہاتھاپائی شروع ہو گئی۔ جے رام پٹھوؤں کی اس حرکت سے اندازہ نہ کر سکا کہ کیوں اس کی گٹھڑی پہلے تھامی اور پھر ایکا ایکی پھینک دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی وجہ کا پتہ چلا۔ پٹھو اکیلے ہی دو مسافروں کا بوجھ اُٹھانا چاہتے تھے۔ ایک جسمانی طاقت کے لحاظ سے سب پر حاوی تھا۔ دوسرے مسافر

کی گٹھڑی لے کر جب وہ جے رام کے بوجھ کے لیے لپکا تو جے رام نے للکارا ”خبر دار! اگر اسے کسی نے ہاتھ لگایا تو۔“

سب کے سب اس پیر فرتوت کی شکل دیکھنے لگے جو کہ اَب گٹھڑی پر دھرنا مارے منھ میں فحش گالیاں منمنا رہا تھا۔ دوسرا مسافر جانتا تھا کہ جب تک پٹھّو دوسرے کے بوجھ سے لد نہیں جائے گا، یہاں سے نہیں ہلے گا۔ اس نے جے رام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”لالہ! دے دو بوجھ اپنا۔۔۔ دیتے کیوں نہیں، آؤ چلیں۔“

جے رام نے قہر آلود نگاہیں اس نئے مسافر کی طرف اٹھائیں، اور پھر یہ جان کر کہ یہ میرے ہی گاؤں کا آدمی ہے، چُپ ہو گیا، ورنہ جھپٹ ہو جاتی۔ نئے مسافر کا جگر خراب تھا۔ آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے تھیلے تھے اور آنکھوں کے اندر ککروں کی سُرخی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ککروں کی خارش سے تسکین پانے کے لیے بار بار اپنے بے حد غلیظ کوٹ کے کفوں کو باری باری آنکھوں پر رگڑتا۔ کچھ لب بسور کر اور آنکھیں پھیلا کر وہ پھر بولا۔۔۔ ”تھوک دو غصّہ۔“

جے رام نے کہا۔ ”لالہ اگر انسان ہو تو ان بندروں کو سبق سکھانے کے لیے بوجھ یہاں رکھ دو۔ پھر اکٹھے جائیں گے۔“

لالہ نے مان لیا اور دونوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ جے رام بولا۔ ”ٹھٹھر میں تمھارا کون ہوتا ہے؟“

”میں بیس سال سے ٹھٹھر میں رہتا ہوں۔ اگرچہ میرے جیون میں تین مکان ہیں، جن کا تیرہ روپیہ ہر ماہ کرایہ آتا ہے، پھر بھی میں ٹھٹھر میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ وہاں کا پانی آنکھوں کے لیے اچھا ہے۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”اَماوٹ بیچتا ہوں۔ جب آموں کی فصل ہوتی ہے تو سینکڑوں من آم ایک بڑے احاطے میں صفوں پر بچھا دیے جاتے ہیں۔ پٹھو پاؤں دھو کر اُن میں گھومتے ہیں اور اپنے پاؤں سے ان کا ملیدہ بنا دیتے ہیں اور پھر اس ملیدہ کو صاف کر کے اور سکھا کر اَماوٹ بنایا جاتا ہے۔“

جے رام نے دور انجن کو پانی پی کر ٹھو کر کے قریب پہنچتے ہوئے دیکھا۔ اُسے خیال

گزرا کہ انجن ٹھوکر سے ٹکرا کر یا تو خود اُلٹ جائے گا، اور نہیں تو ٹھوکر کو پاش پاش کر دے گا۔ جے رام کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رک گیا اور وہ اپنی گٹھڑی پر سے اُٹھ کر لاٹھی کے سہارے کھڑا ہو گیا اور انجن کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹھوکر کے قریب انجن کے کھڑے ہو جانے سے جے رام نے اطمینان کا سانس لیا اور واپس اپنے بوجھ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اماوٹ کا بیوپار کرنے والے تمھارے سب لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''کیسے جانتے ہو؟'' لالہ نے پھر کفوں سے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ ''میں ٹھٹھر ہی کا باسی ہوں۔ آتو کھٹ کا بیٹا۔ چھوٹا اور بڑا بھائی پاگل خانے میں ہیں۔''

لالہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آتو کے بیٹے سے پُر جوش مصافحہ کیا۔ وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ لالہ اپنا سر بھی ہلاتا رہا۔ گویا اُسے کسی ذہنی الجھن کا حل مل رہا ہو۔ جے رام نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''لیکن لالہ! تمھارے خاندان کے سب لوگوں میں اماوٹ کی تُرشی ہوتی ہے اور تم میں ترشی نام کو نہیں؟''

لالہ ہنس دیا۔ جے رام نے جیب میں سے ایک تھیلی بر آمد کی اور اس میں سے

تمباکو نکال کر ہتھیلی پر مسلا اور پھانک گیا۔ اس وقت آسمان صاف تھا اور سورج نکل آیا تھا، جس کے نمودار ہوتے ہی دُھند اترنے لگی اور اس کی وجہ سے سورج اپنی آب و تاب کھو کر ایک کانسی کا تھال دکھائی دینے لگا۔ لالہ کی رعشہ والی آنکھوں کے لیے یہ روشنی بھی زیادہ تھی۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا اور جے رام کے کریدنے پر بولا۔

''گھی اور اَماوٹ کے سب بیوپاری گندے رہتے ہیں۔ ان کے ارد گرد مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن اس اَماوٹ کی بدولت میں نے تین چار مکان بنالیے ہیں اور یہاں سے کئی من اماوٹ ہر سال شہر لاہور کو لے جاتا ہوں۔ کل ہی واپس آکر تین بیسی کم دو ہزار کی وصولی کرنے جارہا ہوں۔۔۔''

جے رام نے یک لخت لالہ کی باتوں میں دلچسپی ختم کر دی اور ٹھٹھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بولا۔ ''لاہور۔۔۔؟ لاہور بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں سب کچھ بک جاتا ہے۔ غلاظت، اماوٹ سبھی کچھ بِک جاتا ہے۔''

پٹھو کچھ دُور کھڑے بے صبری سے اُن دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ مایوس ہو کر چلے گئے اور کچھ اپنے ٹوکروں کے سہارے کھڑے رہے۔ دُور سے ایک

اور سواری دکھائی دی اور سب کے سب اس کی طرف دوڑے۔ جے رام نے پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"چہ چہ ۔۔۔ لالہ تم بہت امیر ہو گئے ہو۔ لیکن اس امارت کا فائدہ ہی کیا؟۔۔۔ تمھاری اپنی پوشش۔۔۔ یہ دیکھو، کمائی تو بازاری عورتوں کی بھی بہت ہوتی ہے، لیکن پیشے پیشے میں فرق ہے نا؟"

لالہ نے آنکھوں پر روک بناتے ہوئے اس بات کی تصدیق کی، کہ یہ آتو کھٹ کا بیٹا بول رہا ہے اور پھر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم چاہتے ہو، تمھیں ساری بھی ملے اور چُپڑی ہوئی بھی۔۔۔ یہ دو باتیں ناممکن ہیں۔"

اس اثنا میں ایک پٹھو تیسرے گاہک سے بھی مایوس ہو کر لوٹا۔ لالہ نے جلدی سے اسے اپنا بوجھا اٹھوا دیا اور کچھ دور جا کر ٹھہر گیا۔ پیچھے کی طرف گھوما اور ایک پورا پنجہ اور ایک انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ "اس فصل میں چھ سو من اماوٹ شہر لے جاؤں گا۔ اور ہو سکا تو ایک ہزار۔۔۔" اور ایک ہزار کہتے ہوئے اس نے اپنے

دونوں پنجے پوری طرح پھیلا دیے اور اپنا بوجھ آپ ہی اٹھائے گھاٹی کی طرف بڑھا۔ جے رام اس کے غائب ہونے تک اس کے میزان سے بازو، کبھی ایک طرف سے نیچے اور کبھی دوسری طرف سے اوپر ہوتے ہوئے دیکھتا اور منھ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ حتیٰ کہ لالہ ایک چٹان کے پیچھے غائب ہو گیا۔

اس وقت انجن واپس لائنوں کے ایک جال میں الجھنے کے لیے جیحون دوآبہ ٹرمینس چھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ وہ ادھر رُخ کیے ہوئے تھا، جدھر سینکڑوں جنکشن اسٹیشن اور سی کلاس کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ اور ہر سال ہزاروں من اماوٹ کی کھپت تھی۔ انجن ایک خوش بلّی کی طرح خُو خُو کر رہا تھا۔ اس کی آواز کبھی اونچی اور کبھی مدھم ہو جاتی۔ کبھی ایک اونچی سیٹی بازار میں کھیلنے والے بچوں کو ڈرا دیتی، یا خلاصیوں، سگنل مینوں کے نڈر بچّے انجن کی نقل میں سیٹیاں بجانے لگتے اور ایک دوسرے کی قمیص پکڑ کر ایک ہاتھ سے پسٹن بناتے ہوئے چلنے لگتے۔

جے رام نے اس پریشانی کے عالم میں گٹھڑی اٹھائی اور مسافر خانے کی طرف چل دیا۔ دنیا کتنی وسیع اور لامتناہی تھی، لیکن اس پر اس کا ظرف کس قدر تنگ ہو

گیا تھا۔ مسافر خانے میں بھیڑ صاف ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک خوش پوش سامنے آیا اور بولا۔

"میں ٹکٹ لینا چاہتا ہوں بُڈھے! کیا میرے اس اٹیچی اور بستر کا خیال رکھو گے؟"

جے رام نے اس خوبصورت چھوکرے کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اثبات میں اپنا سر ہلائے، نوجوان اپنا سامان رکھ کر جا چکا تھا۔ جے رام ایک مطیع خادم کی طرح ان چیزوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ نوجوان کچھ دیر کے بعد ٹکٹ لے کر لوٹا اور جے رام نے پوچھا۔

"صاحب بہادر! کدھر جا رہے ہیں آپ؟"

نوجوان نے یہ خطاب پسند کیا۔ اس نے خوش ہو کر ایک سگریٹ سلگایا، ایک ادا سے دِیاسلائی کو بجھا کر پاؤں تلے مسلتے ہوئے وہ قریب قریب سارے کا سارا گھوم گیا اور بولا۔

"میں بہت دور جا رہا ہوں، بُڈھے بہت دور۔۔۔"

"دور۔۔۔؟"

"ہاں دور۔۔۔ تمھارے قیاس سے پرے۔۔۔"

"کیاسان فرانسسکو جارہے ہو آخر؟"

نوجوان نے حیران ہو کر جے رام کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں بُڈھے کی جغرافیائی علم سے مرعوب ہوتے ہوئے بولا۔ "بمبئی جارہاہوں بابا۔"

"بمبئی۔۔۔؟ ہے تو دور ہی۔" جے رام سوچتے ہوئے بولا۔ "سیر کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں ایک فلم کمپنی میں ایکٹر بھرتی کرلیا گیاہوں بابا۔۔۔ ابھی مجھے ولین کا پارٹ ملاہے۔ ولین سمجھتے ہونا؟ وہ چھوکراجو عاشق اور معشوق کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور جس کی لاتوں اور گھونسوں سے مرمّت ہوتی ہے۔ لیکن مجھے ان لاتوں اور گھونسوں کی کوئی پروانہیں۔۔۔ ولین کے بعد اگلا قدم ہے ہیرو۔۔۔ میں کچھ بنوں گا، بابا تمھاری دعاچاہیے۔"

جے رام نے دعا کا ایک لفظ بھی منھ سے نہ نکالا۔ اس کی نگاہوں سے وحشت سی ٹپکنے لگی۔ اس نے جنگلہ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ کانپ رہا تھا۔ نوجوان نے

اپنا اٹیچی، ٹرنک اور بستر ایک پٹھو سے اُٹھوایا، اور پھاٹک کے پیچھے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد پُل پر اس کی ٹانگیں چلتی ہوئی دکھائی دیں۔ جے رام چند لمحے گومگو کے عالم میں کھڑا رہا۔ اچانک ایک خیال کے آنے سے اس کے منھ پر رونق آ گئی۔۔۔ اس وقت گاڑی چھوٹنے کی گھنٹی بجی۔ جے رام بھاگا اور ٹکٹ گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بہت سے پیسے نکال کر کھڑکی میں بکھیر دیے۔ تار بابو بولا۔

"کدھر جاؤ گے بُڈھے؟"

"کرتار پور۔۔۔ کرتار پور۔۔۔" جے رام نے دُہرایا اور گاڑی چھوٹنے سے چند ہی لمحہ پہلے جے رام گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس وقت جب کہ ٹھوکریں، یکّہ و تنہا کرین، بجّو باورا اس کی نظروں سے غائب ہوا، اُسے زندگی کافی دلچسپ دکھائی دینے لگی تھی۔

گالی

چیٹھی رساں کچھ نئے تھے اور کچھ پُرانے۔۔۔ لیکن ان سب لوگوں کا بلا لحاظ مذہب وملّت ایک قبیلہ سا بن چکا تھا۔ ان میں رحمت نور اور پرتاپ سنگھ کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔

"۶۳ الف نہیں آیا؟" پرتاپ سنگھ نے دن بھر کے کام کے بعد اپنی "واپسی" میز پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

"خواجہ۔۔۔" کلرک نے نفی میں سر ہلا دیا اور آنکھ کے ایک گوشے سے پرتاپ

سنگھ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ خواجہ جانتا تھا کہ تریسٹھ الف یعنی رحمت نور اور پرتاپ سنگھ میں جب تک جوتی پیزار نہ ہولے کسی کو کام کا مزا ہی نہیں آئے گا۔

"کھاجا۔۔۔" پرتاپ سنگھ نے خواجہ میں رحمت نور کا ایک مہنگا بدل تلاش کرتے ہوئے پکارا۔ خواجہ کو معلوم تھا کہ پرتاپ سنگھ نے جان بوجھ کر اس کے نام کو بگاڑا ہے۔ اس نے ایک بڑی ہوشیار نگاہ سے پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھا اور بولا۔
"کیوں بڑی خارش ہو رہی ہے سردار؟"

اچانک پنگ پانگ کی سی بڑی میز کے دوسری طرف رحمت نور اپنی شکاری جالی اور غیر تقسیم شدہ پارسل رکھتا ہوا دکھائی دیا۔ گرمی کی شدّت سے اس کی بُری حالت تھی۔ پسینہ کولھوں کے فراز سے نشیب میں گرتا ہوا خاکی پتلون کے بیچوں بیچ پنڈلیوں پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ اس کے جہلمی تراش کے بال پگڑی کی لپیٹ میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ پرتاپ سنگھ نے "کھاجا" سے ٹکّر لینی مناسب بھی نہ سمجھی اور فوراً تریسٹھ الف کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"ابے رحمت نور۔۔۔ دیکھ تیری عقل کے بخیے اُدھڑ رہے ہیں۔"

رحمت نور نے اپنی ذات اور اپنے ارد گرد سے باخبر ہوتے ہوئے اپنے بال پگڑی میں دبانے شروع کیے۔ بکھرے ہوئے بالوں کے متعلق عقل کے بخیے کا کنایہ غالباً پرتاپ سنگھ نے۔۔۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے، اگر دے گا تو عقل کے بخیے ادھیڑ دے۔۔۔ کی ضرب المثل سے لیا تھا۔ اس میں رمز یہ بھی تھی کہ رحمت نور چندیا سے چٹیل تھا اور یہی اس کی دُکھتی رگ تھی۔

پرتاپ سنگھ نے اسی پر اکتفانہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اڑھائی بال ہیں سالے کے، اور وہ بھی تو سنبھالے نہیں جاتے۔'' اور یہ سب کچھ اس طور پر کہا کہ کوئی سُنے یا نہ سُنے، لیکن حق حقدار کو پہنچ جائے۔ ''کھاجا'' سُن کر مسکرایا تو پرتاپ سنگھ کو اس مسکراہٹ میں تائید اور شہہ دکھائی دی۔ پھر پرتاپ سنگھ اپنے لمبے کیسوں (بالوں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھو واہگورو نے اُدھر کتنی عقل دی ہے، مگر کیا مجال کہ بخیہ اُدھڑا ہوا نظر آئے۔''

خواجہ نے دل ہی دل میں اس خوش مذاقی پر داد دی اور کہا۔ ''تم نے اپنی عقل کے ناخن اُتروا لیے ہیں، لیکن تریسٹھ الف نے نہیں۔''

رحمت نور نے میدان ہاتھ سے جاتے دیکھا تو بولا۔

"خواجہ جی۔۔۔ سُنا ہے اب سکھوں کے بارہ نہیں بجیں گے؟"

ان دنوں حکومت نے جنگی مصلحت کی بنا پر اسٹینڈرڈ ٹائم میں ایک گھنٹہ کا اضافہ کیا تھا اور رحمت نور کا اسی بات کی طرف اشارہ تھا۔ پرتاپ سنگھ نے یہ حربہ اپنے اوپر لے کر اس کی وقعت کو کم کر دیا۔ اپنے آپ پر ہنسنا ایک بہت بڑا فن ہے۔ پرتاپ سنگھ بولا۔

"بلکہ ایک دن میں دو دفعہ بجا کریں گے۔ ایک دفعہ جب کہ بارہ بجا کرتے تھے اور دوسری بار جب کہ ایک بجے بجا کریں گے۔"

اب تک سب پرتاپ سنگھ اور رحمت نور کی ان باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اُن کو دیکھ کر ہیڈ کلرک کے نائب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ آپ اُن معدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو اندر سے شریف ہوں، لیکن یوں بدمعاش نظر آئیں۔ بڑی بڑی سیندھیا مونچھیں، گھنے ابرو، ناک بھدی اور پچکی ہوئی۔ آپ نے آتے ہوئے اپنی اہمیت جتائی۔ ادھر اُدھر دیکھ کر ضبط و احتساب

کا سماں پیدا کرتے ہوئے بولے۔۔۔ ”ہیڈ کلرک صاحب بہت خفا ہو رہے ہیں۔ شور نہ مچایئے۔۔۔“ اور پھر اُن کے شور میں شریک ہو گئے خود بھی۔ طبیعت شاہانہ پائی تھی بلکہ اکبرانہ۔ کیونکہ اس دن باگھ اور ہوائی میں لڑائی اٹھتی دیکھ کر آپ کے کئی جذبات کو آسودگی ہوتی تھی۔ ہیڈ کلرک صاحب تو اپنی سیٹ سے ہلتے ہی نہیں تھے۔ انہیں ہمیشہ مثال قائم کرنے کی پڑی رہتی تھی۔ تقلید کی عیاشی کا حظ نہیں اُٹھایا تھا۔ نئے نئے ڈویژن سے بدل کر آئے تھے۔ نہایت شریف، دُبلے پتلے، حسناتِ متبرکہ کے حامل۔ دفتر میں دو منٹ کی بھی فرصت ہوتی تو آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ کو یاد کرنے لگتے۔ مثنوی مولانا روم اور تذکرۃ الاولیاء سے تعلیم شروع ہو کر انہی دو کتابوں پر ختم ہو جاتی تھی۔ خشوع و خضوع کے بڑے قائل تھے۔ ذرا جذبات کو کسی نے چھیڑا تو آنسو ہیں کہ بہے چلے جا رہے ہیں۔ خیر آپ وہیں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ جب پرتاپ سنگھ نے رحمت نور کا حربہ اپنے اوپر لے لیا، تو رحمت نور نے منی آرڈروں کی رسیدیں اکٹھی کیں اور کانوں کو چھوتے ہوئے بولا۔

”چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔“

پرتاپ سنگھ تلملایا۔ فارسی اس کے باپ دادا کو نہیں آتی تھی اور رحمت نور منشی آدھی آدھی بات پر گُلستاں کے حوالے دے۔ اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں چاروں طرف دیکھا، گویا کہہ رہا ہے، یہ ظلم ہے، سراسر ظلم ہے۔ پنجابی بولے پنجابی میں جواب لے، ذرا میدان میں آئے۔ پرتاپ سنگھ ہر غیر ملکی زبان کو کالا علم کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ سٹپٹاتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کالا علم ہے خواجہ صاحب؟" اور اب کے خواجہ صاحب کا نام بڑے ادب اور تپاک سے لیا گیا۔ خ علاحدہ اور واؤ معدولہ۔ اور پرتاپ سنگھ بالکل اس طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی مدد کے لیے اپنی وحشت ناک اور پھٹی پھٹی نگاہیں اِدھر اُدھر چاروں طرف ڈالتا ہے۔ خواجہ اور نائب ہیڈ کلرک، جسے ڈاک خانہ کی اصطلاح میں تحصیلدار کہتے تھے، بولے۔۔۔ "رحمت نور کہہ رہا ہے۔۔۔ اگر کفر کعبہ سے ہی پیدا ہونے لگے، تو مسلمانی کدھر جائے گی۔۔۔؟"

پرتاپ سنگھ نے بدلہ چکاتے ہوئے کہا۔ "تو مسلمانی میرے پاس چلی آئے گی۔ اِدھر واہگورو کا دیا بہت کچھ ہے۔۔۔" اس پر سب خاموش ہو گئے۔

رحمت نور اور پرتاپ سنگھ، کرپا اور عنایت مسیح، یہ سب لوگ ہنستے کھیلتے، چیختے

چلاتے ایک سانس میں دعائے خیر اور دوسرے میں فحش گالی بکتے اپنا اپنا کام کیے جاتے۔ ان کا سینگ فرا، ان کا کورس ایک قومی ترانہ کی طرح پُر جوش اور جمود شکن ہوتا۔ ان کی گالی ہمیشہ مختصر ہوتی، لیکن دعاؤں کے دفتروں سے زیادہ بلیغ اور پھر زود اثر۔۔۔!

ان چیٹھی رسانوں میں سے کچھ شہر کے بسنے والے تھے۔ لیکن اکثر دیہات میں سے آئے تھے۔ سب کے سب سیدھے سادے تھے، اور بڑے احتیاط سے نا تراشیدہ، مگر ان کی تہذیب چیونٹی اور شہد کی مکھی سے بھی زیادہ پُرانی تھی۔ جس فنّی مہارت اور پُرکاری سے یہ الفاظ کے گھروندے بناتے، اس کے لیے اب زیادہ تراش خراش کی ضرورت بھی تو نہ رہی تھی۔ یہ بنا جانے بوجھے گالی کے لطیف فن سے واقف تھے اور صدیوں سے اس ادارے کی اہمیت سے آشنا اور اس بڑی سچائی تک پہنچنے کے لیے کہ گالی بعض دفعہ اپنے اظہارِ خیال کا مختصر، جامع اور واحد طریقہ ہے۔ سوچنے کے لیے نہ کسی درمیانی عمل کی ضرورت تھی، نہ تجزیہ اور جواز کی۔

ڈاک خانہ کی جوت کے یہ دو سو بیل اسی طرح ہنس کھیل کر اپنے دبے ہوئے

جذبات کو فحاشی سے آسودہ کر کے جب ایک ساتھ اور ایک سمت زور لگاتے تو ڈاک خانے کا یہ چھکڑا چلتا رہتا، لیکن اس واقعہ کے دوسرے روز ان کی گاڑی کی رفتار ناہموار ہو گئی۔

دوسرے دن پھر رحمت نور قدرے دیر سے برانچ میں داخل ہوا، لیکن پرتاپ سنگھ کو دیکھ کر اس کی پیشانی کے تمام شکن استوار ہو گئے۔ پرتاپ سنگھ نے بھی رحمت نور کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ رحمت نور نے قمیص کا تکمہ ڈھیلا کیا اور قمیص کو پنکھا بنا کر ہلاتے ہوئے کہا ''اُف! کتنی گرمی ہے!۔۔۔ الامان!۔۔۔ الحفیظ!''لیکن آج پرتاپ سنگھ کی حالت غیر تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے لو لگ گئی ہے۔ رحمت نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج خالصہ جی کی بکری بیٹھی ہوئی ہے۔''

پرتاپ سنگھ خاموش رہا۔ رحمت نور بولا ''ابے جھکّڑ سنگھ!''

پرتاپ سنگھ نے پھر رحمت نور کی طرف دیکھا۔ مسکرایا اور بولا۔ ''خالصہ جی کی بکری نہیں بکرا ہوتا ہے۔'' اور پھر وہ بکرے کی طرح ممیایا۔

سب ہنس دیے اور گویا لوگوں کی دیوالی ہوتی ہے، سردار جی کا دیوالہ۔" خواجہ نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "جواب مسکت دیا ہے پرتاپ سنگھ نے۔ مان لیا ہم نے اسے۔ آج حالت غیر ہے لیکن پھر بھی۔۔۔ ہاتھی جیتا ایک لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا۔"

پرتاپ سنگھ نے فخر سے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ خواجہ نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر رحمت نور کو جھڑکتے ہوئے بولا۔ "رحمت نور! بھئی واپسی جلدی دو۔ دیکھو سردار سب کچھ لَوٹا چکا ہے۔"

"جھک مارتا ہے سردار۔" رحمت نور نے کہا۔

خواجہ نے اپنے آپ سردار کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "بہتّر منی آرڈروں میں سے صرف تین واپس لایا ہے، صرف تین!"

پرتاپ سنگھ نے فاتحانہ انداز سے رحمت نور کی طرف دیکھا اور کہا۔ "رحمت نور اور کام۔۔۔ اب بیچاری رنڈیوں کو بھی کاتنا پڑ گیا ہے۔"

رحمت نور نے خواجہ کی طرف دیکھا، خواجہ مسکرا دیا اور رمز و کنایہ میں گویا

اجازت دے دی۔ رحمت نور نے اس سرکاری تائید سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے تھیلے کو میز سے سرکا دیا۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے اور بائیں ہاتھ سے میز پر طبلے کی تھاپ دیتے ہوئے گانے لگا۔

بھائی جی دی کچھ وچ گوہ ڈر گئی

اک کڈھن لگے دوجی ہور ڑر گئی

سردار جی کے کچھرے (سکھوں کی ایک شرعی پوشش) میں گوہ داخل ہو گئی ہے۔ ایک گوہ کو نکالنے لگتے ہیں، تو دوسری داخل ہو جاتی ہے۔

سب کے سب اس زٹل قافیہ پر ہنسنے لگے۔ جنگ کی وجہ سے قیمتوں کی مہنگائی اور مشاہرے کی کئی سماجی دباؤ کی وجہ سے جذبات کا ضبط، سب کچھ ان ہی کلرکوں اور چپٹھی رسانوں کے چہرے پر لکیروں کی صورت میں لکھا اور ہوائیوں کی صورت میں چھایا ہوا تھا۔ لیکن افسوس فحاشی اور دشنام طرازی کی وجہ سے انہیں یہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا اور وہ ہنسی خوشی اپنا کام کیے جاتے، بلکہ کام باقاعدگی اور تیزی سے ہوتا تھا۔ اس علیک سلیک کے بعد رحمت نور، پرتاپ سنگھ، ان کے

ساتھی اور کلرک سب آسودہ خاطر ہو گئے۔ سارے دن کی مشقت کے بعد گویا تازہ دم ہو گئے۔

رحمت نور کا علاقہ ۔۔۔ حلقہ جسے دفتری زبان میں تریسٹھ الف کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بہت گندہ علاقہ تھا۔ یہ شہر کی نئی آبادی تھی۔ آج اگر سفید زمین ہوتی تو کل وہاں ایک خاصا محل کھڑا ہوتا ۔۔۔ کہاں کی اینٹ، کہاں کا روڑا، بھان متی نے کُنبہ جوڑا ۔۔۔ کوئی ملتانی میں "روٹی میکوڈھے" کہتا تو کوئی "کڑھائی و سنجنی" کوئی پوٹھوہار کی تہذیب کا باشندہ ہوتا، تو کوئی کشمیری ککے زئی، اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ نتیجہ موسیقی نہیں، ایک بے ہنگم سا شور۔ نیم بورژوا سے لوگ جو محض اس بات پر خوش رہتے کہ انہیں کسی کی پروا نہیں ہے۔ جو کسی کے مکان سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کا پتہ بتانے میں اپنی سُبکی سمجھتے۔ ایسے علاقے میں ڈاک تقسیم کرنا رحمت نور کا ہی کام تھا، اور پرتاب سنگھ کا علاقہ اس سے بھی بڑا تھا۔ صاف تھا، سُتھرا تھا، لیکن ریلوے کالونی کے ہر باشندے نے ایک کُتّا رکھا ہوا تھا جو ہر روز بلا ناغہ پرتاپ سنگھ کی گردن دبوچتا۔ دونوں نے اس کا حل نکالا ہوا تھا۔ رحمت نور نے علاقے کی عورتوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی اور

پرتاپ سنگھ کتّوں سے بچنے کے لیے ایک آنہ روز کے چھیچھڑے خرید لیتا اور جب کوئی کتّا کاٹنے آتا تو پچکار کر چھیچھڑوں کی رشوت دے دیتا۔ اس کے باوجود گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ان کی جان نکل جاتی۔ کہیں بخشش مل جاتی تو ایک آدھ گلاس سکنجبین کا پیا جاتا، نہیں تو ٹھنڈا پانی اور گھر کی رانی۔۔۔

دھوپ کی شدّت سے آج پرتاپ سنگھ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی مسلسل خاموشی کے باوجود رحمت نور نے اسے دبوچ رکھا اور پوچھنے لگا۔ ''آج دیر سے کیوں آئے ہو پرتاپ سنگھ؟''

''تمھاری ماں کے ساتھ سو رہا تھا۔'' پرتاپ سنگھ نے ایک غصیلے کتّے کی طرح باچھیں اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ رحمت نور ناراض نہیں، خوش ہوا کہ وہ پرتاپ سنگھ کو چڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اچانک بائیں طرف سے ایک بادل کی گرج سنائی دی۔ یہ بادل نہیں تھا، رشید الدّین ہیڈ کلرک صاحب تھے۔ لبوں کے کنارے کف کی ایک کافوری تحریر سی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کے ڈبل کنکھیوں کے پیچھے سے چندھی سی آنکھیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے دو چھوٹے چھوٹے پائپوں میں سے چنگاریاں نکل رہی ہوں۔ بولے ''یہ دفتر ہے یا

فحاشی کا اڈّہ؟ میں یہاں کسی کو گالیاں نہیں بکنے دوں گا۔"

"بات یہ ہے جناب۔" پرتاپ سنگھ نے جوابِ دعویٰ کے انداز میں کہا۔ "میں ۔۔۔میں۔۔۔"

"میں میں کا بچہ۔۔۔ خبردار جو آئندہ ایسا ویسا لفظ نکالا تو۔۔۔"

"میری بات۔۔۔"

"میں کوئی بات وات سُننا نہیں چاہتا۔ سمجھے۔۔۔ میں پوسٹ ماسٹر کے سامنے اس امر کی شکایت کروں گا۔"

سب خاموش ہو گئے۔ رپٹ پوسٹ ماسٹر صاحب کے حضور میں پیش کی گئی۔ پرتاپ سنگھ اور رحمت نور پر چارج شیٹ لگا۔ لیکن معاملہ تنبیہ سے آگے نہ بڑھا۔ بڑی خیر ہوئی۔ ایک باقاعدہ آفس آرڈر نکالا گیا جس میں اخلاقیات کے متعلق ایک فحش ابتدائیہ تھا اور اس کے بعد ایک غیر مرکب حکم تھا۔ "جو کوئی چٹھی رساں منی آرڈروں، چٹھیوں، بیرنگوں، پارسلوں، رجسٹریوں کی واپسی دیتے ہوئے فحش کلامی کرے گا، اسے فوراً معطل کر دیا جائے گا۔" اور ایمرجنسی پر قابو

پانے کے لیے ہیڈ کلرک کے اختیارات بھی وسیع کر دیے گئے۔

اب دفتر ایک اچھا خاصا قبرستان بن گیا تھا۔ کان مقابل کی خاموشی کو پا کر سارا دن سائیں سائیں کرتے رہتے اور ہیڈ کلرک رشید الدّین آنکھیں بند کر کے رُوحانی منازل طے کرتا اور اپنے نفس کی بانگِ دراسُن کر حظ اٹھاتا۔ اس کی روح کا جو وقار تکلم سے ضائع ہوتا تھا، اب محفوظ تھا۔

رحمت نور ایک روز معمول سے زیادہ دیر میں آیا۔ اس کے چہرے کی لکیریں زیادہ گہری تھیں۔ آتے ہی اس نے اپنی تھیلی نیچے رکھ دی اور پنگ پانگ والی میز کے کنارے بیٹھ گیا اور واپسی کے کاغذ اور چیزیں بکھیر لیں۔۔۔

رحمت نور نے دونوں ہاتھ باندھ دیے اور منّت کے لہجہ میں بولا۔

"خواجہ جی! اللہ رسول کے لیے مجھے تریسٹھ الف سے نکالیے۔ میں مر جاؤں گا۔"

خواجہ نے روکھے پھیکے انداز میں کہا۔ "یہ تم لوگوں کا بہانہ ہے، میں تمھاری شکایت کروں گا۔ کیا اس سے پہلے تم نے اس حلقے میں کام نہیں کیا۔۔۔؟"

"خواجہ جی۔" رحمت نے اسی طرح منّت سے کہا۔ "اب اس رقبہ میں آبادی

دو گنی ہو گئی ہے، شاید یہ آپ نہیں جانتے۔ اور اگر میرے کہنے پر آپ کو یقین نہیں ہے تو ٹاؤن انسپکٹر صاحب کو کہیے کہ وہ چل کر دیکھ لیں۔۔۔"

اور پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"آپ جانتے ہیں اوور سیئر بھی اپنے دفتر کے کیس کرنے کے لیے مجھے دیتا ہے اور خالد صاحب ٹاؤن انسپکٹر صاحب بھی۔"

اور پھر رحمت نور سفید خاکی دیوار کی طرف دیکھنے لگا، جہاں ایک کیلنڈر کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن رحمت نور کو اس دیوار پر جانے کیا کچھ دکھائی دے رہا تھا، وہ کچھ دیر چُپ رہا، پھر بولا۔

"خواجہ صاحب۔ میری سفارش کیجیے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بال بچّے ہیں۔"

اور رحمت نور منی آرڈروں کی رسیدیں پکڑ کر پھر دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ پرتاپ سنگھ آیا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور آتے ہی رحمتِ نور سے کچھ دور ہٹ کر بولا۔

"چودھری صاحب سلام۔"

چودھری صاحب نے لمباسا مُنہ بناتے ہوئے کہا

”وعلیکم السلام۔ کہیے مزاج تو اچھے ہیں؟“

”رحمت نور اور پرتاپ سنگھ اس رسمی گفتگو سے اتنے مایوس نہیں ہوئے، جتنے خواجہ صاحب۔ وہ ہکّا بکّا ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے انہوں نے پن ہولڈر اپنے دانتوں میں دبایا، اور پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھے بغیر بولے۔

”پرتاپ سنگھ واپسی دے دو۔“

پرتاپ سنگھ نے خواجہ صاحب کی طرف نہ دیکھا اور جلدی جلدی اپنے تھیلے میں سے منی آرڈر نکالنے لگا۔ ہیڈ کلرک صاحب نہ جانے کیوں ہانپتے سے اُٹھ کھڑے ہوئے، اور دونوں ہاتھ بغل میں دے کر کمرے کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے اور منھ میں بڑبڑانے لگے۔

”آج بہت دیر ہو گئی ہے۔۔۔ بہت دیر۔۔۔“

خواجہ صاحب نے تائید کرتے ہوئے کہا ”جی ہاں۔۔۔ ہیڈ کلرک صاحب۔۔۔

پتہ نہیں کیا بات ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دن چھوٹے ہوگئے ہیں۔"

پرتاپ سنگھ نے منی آرڈر میز پر بکھیر دیے۔ خواجہ صاحب نے ایک نظر منی آرڈروں کی طرف دیکھا اور پھر قلم کو منھ میں رکھ لیا۔۔۔ رشید الدّین صاحب نے رسیدوں کی طرف دیکھا اور بولے۔۔۔ "پرتاپ سنگھ اتنی واپسی کیوں لائے ہو؟"

پرتاپ سنگھ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "سرکار، یا بندے دوہری تہری کوشش کے باوجود نہیں ملتے۔نہ جانے لوگ کدھر چلے گئے ہیں؟"

ہیڈ کلرک نے سراجی کبوتر کی طرح گردن پھُلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔۔۔"

رشید الدّین اپنی میز کی طرف جارہے تھے، لیکن نہ جانے انہیں کیا خیال آیا، یکلخت پلٹ پڑے اور خواجہ صاحب سے خطاب کرتے ہوئے بولے۔ "خواجہ یار! ان کی کوتاہیوں کو ایرر بک میں نوٹ کر دینا۔" خواجہ اپنی کرسی سے اٹھا اور میاں صاحب تک پہنچتے ہوئے بولا۔۔۔ "میاں جی جھاڑ جھپٹ سے کام چل جاتا

ہے تو کیا ضرورت ہے دفتری کارروائی کی؟ ریکارڈ خراب ہو جائے گا بے چاروں کا۔"

ہیڈ کلرک نے کڑی نگاہوں سے خواجہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ سب شرارت ہو رہی ہے۔"

خطِ مستقیم اور قوسین

پے در پے مقابلے کے چھ امتحانوں میں ناکام سعادت، ٹیلر ماسٹر کی دُکان پر کھڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اچھے کپڑوں کے ذریعے سے کمیشن کے ممبروں پر رعب ڈالنا ضروری ہے اور اسی لیے اس نے اپنا سوٹ باسط کے ہاں سلوایا تھا۔ اس نے دکان پر کھڑے ہو کر زولوٹاپ میں لکھے ہوئے بورڈ کی طرف دیکھا۔۔۔ ''باسط لندن ڈپلو میڈ کٹر۔۔۔''

دکان میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دائیں اور بائیں جھانکا۔ اس کے دل کے

کسی کونے میں خواہش تھی کہ اس کی جان پہچان والا کوئی شخص اُسے باسط کی دکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لے۔ باسط کٹنگ کے لحاظ سے بڑا استاد تھا۔ کٹنگ کی انگریزی فرم کے علاوہ کوئی اس کا لگانہ کھاتا تھا اور شہر کے سب درزی اس کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ لیکن اس وقت بازار میں دفتر جانے والوں کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا اور وہ دفتر جانے والے، انٹرویو کی حد سے گزر چکے تھے۔ وہ اس وقت باسط یا ماجد کی دکان پر کیوں آتے؟

لیکن اب انٹرویو سعادت کے لیے ایک عام چیز ہو چکے تھے، اگرچہ اچھے سوٹ کا خیال اس بات کو جھٹلاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک اور صرف ایک بار وہ اچھی "فال" پتلون اور گردن پر جم کر آنے والے کوٹ پہن کر کمیشن کے سامنے چلا جائے۔ اس کے بعد چاہے وہ لیا جائے یا نہ لیا جائے، اس میں اس کا کوئی قصور نہ ہو گا۔ وہ اپنے سر سے ایک خوبصورتی کے ساتھ ایک الزام ہٹانا چاہتا تھا۔۔۔ دکان پر جاتے ہوئے اس نے باسط کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر تموّل کے آثار نظر آتے تھے۔ سعادت کو دیکھتے ہی باسط ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا۔

"اوہ۔۔۔ آیئے۔۔۔ آ۔۔۔ پ رُک کیوں گئے؟"

"یوں ہی!" سعادت نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کہیے میرا کام ہوا یا نہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔ اتنے تنگ وقت کے باوجود۔۔۔"

"تو لائیے دیجیے۔۔۔ مجھے کہیں پہنچنا ہے۔"

ماسٹر باسط نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "صرف بٹن ٹانکنے باقی ہیں آغا صاحب۔"

"اوہو!" سعادت نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ "درزیوں کی یہ عادت نہ گئی۔۔۔ کہ بس صاحب ایک سیکنڈ کا کام ہے۔ بس آدھے سیکنڈ کا، اور وہ سیکنڈ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جاتا ہے۔ درزی خواہ لندن سے کام سیکھ آئے یا ٹورنٹو سے، یہ آدھ سیکنڈ۔۔۔"

باسط نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "گستاخی معاف آغا صاحب، آپ جانتے ہیں کہ سوٹ کا کپڑا ہمیں وقت پر دیا تھا۔۔۔ لیکن استر کے لیے اٹیلین آپ دو دن کے بعد دینے آئے تھے اور وہ بھی دو اڑھائی بجے کے قریب۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ

تیسرا دن بھی آپ کے ذمہ پڑا۔۔۔"

"اچھا، اچھا۔۔۔" سعادت نے خاموش ہوتے ہوئے کہا۔ "اب آپ باتوں میں زیادہ وقت نہ لگائیے۔۔۔ اور کاریگر کو کہیے کہ وہ بٹن جلد ٹانک دے۔"

باسط نے ایک کی جگہ دو کاریگروں کو سعادت کا سوٹ دے دیا اور کہا۔ "صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ یہ کام پلک جھپکتے میں تیار ہو جائے۔" اور اس کے بعد ماسٹر باسط نے بڑے احترام سے آغا سعادت کو دکان کے اندر بٹھا دیا۔ خدا جانے اس جگہ پر بٹھانے کے لیے باسط کی طرف سے اہتمام ہوا تھا یا نہیں، لیکن یہ بات درست تھی کہ وہاں سے دُکان کا کونہ کونہ نظر آتا تھا۔ اور تمام وہ تصویریں جن میں اچھے سے اچھے سوٹوں میں ملبوس اکثر نوجوان انگریز کسی خوبصورت بلانڈ یا برونیٹ کے ساتھ ہوا خوری کے لیے جا رہے تھے، نظر آ رہی تھیں۔ سامنے چار خانے کی ہٹنگ کوٹ میں گھوڑے پر، یا پلس فور میں گولف کی چھڑی کو کندھوں سے اوپر اٹھائے کوئی صاحب دکھائی دیتے تھے۔ ایک بڑی سی تصویر میں کارنروں کی ڈائنا اپنے کتّے کو تھامے کھڑی نظر آتی تھی، اور اس کا گون ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ ڈائنا کا جسم لباس میں ہونے کے باوجود لباس سے علاحدہ نظر آتا تھا۔

اس کی پوشاک میں بہ ظاہر درزی کی قدرت سے زیادہ خدا کی قدرت نظر آتی تھی۔ لیکن چونکہ ہر فن کار کا مقصد خالق کی قدرت کو سامنے کرنا اور آپ خالق کے انداز میں چھپ جانا ہے، اس لیے کسی ہوشیار کاریگر نے احتیاط کے ساتھ ایک بے احتیاطی سی پیدا کر دی تھی، ورنہ اگر وہ تصویر صرف خدا کی ہوتی تو باسط۔۔۔لندن ڈپلومیڈ کٹر۔۔۔کی بجائے شہر کے کسی کلال خانے میں ہوتی۔

اور یہ ڈائنا کی تصویر پر ہی موقوف نہیں تھا، جہاں سعادت بیٹھا تھا وہاں سے شیشوں کے اندر قد آدم مجسمے نظر آتے تھے، جو اتنے سرخ سپید اور چپ تھے کہ ان سے ڈر لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ چپ تھے، اگرچہ بولتے تھے، تمام کے تمام مختلف شیڈ کی لیڈی ہملٹن پہنے اپنے سراپا کو دیکھ رہے تھے اور ان کے قریب ان بے آوازوں کی آواز، ماسٹر باسط فیتے کو بے پروائی سے گلے میں ڈالے، ڈائنا اور لیڈی ہملٹن سے بے خبر اپنا حساب کتاب کر رہا تھا۔

ابھی دن شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ بل بھی وصول ہونے لگے۔ دو تین آدمی تو اس خاموشی کے ساتھ ہاتھ میں پیسے تھما گئے کہ وہاں چور بازار ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اگرچہ وہاں ایسا بازار ہونے کی گنجائش نہ تھی، صرف سینے سلانے کا کام تھا۔

شاید اچھی دکان کی نشانی یہی تھی کہ اس کے چور بازار ہونے کا پتہ چلے۔ سعادت کے دیکھتے دیکھتے ماسٹر باسط نے دو اڑھائی سو روپے اپنے رومال ٹاپ کی میز کے ایک ڈبے میں رکھ دیے، اور ٹاپ کو کھینچ کر میز کی سطح کے برابر کر دیا۔ چابی بدستور گچھے میں تالے کے اندر لٹکی رہی۔ ان روپوں میں ساٹھ روپوں کا سعادت خود اضافہ کرنے والا تھا۔

سعادت جھلّا گیا۔ آخر اس نے گناہ کیا کیا ہے جو اسے روپے نہیں ملتے، وہ انٹرویو میں کامیاب نہیں ہوتا۔ سوچتے سوچتے وہ صرف یہی سوچ سکا۔۔۔ آخر ماسٹر مجھے ممنون کرنے کے لیے میرا سوٹ جلدی نہیں تیار کر سکتا تھا؟ وہ ایک کاریگر کو زیادہ عرصہ بٹھا لیتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ اسے چار چھ آنے اوور ٹائم کے دینے پڑتے لیکن چیز تو مجھے وعدہ پر مل جاتی۔ شاید باسط۔۔۔ لندن ڈپلومیڈ۔۔۔ ہونے کی وجہ سے کاریگروں کو وقت پر بلاتا اور وقت پر چھٹی دیتا ہے۔ لیکن لندن سے ڈپلوما اس نے کپڑا کاٹنے کا حاصل کیا ہے۔ وقت کا ڈپلوما تو اپنا ہی ہے اور اسے کاریگروں کی نسبت اپنے گاہکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہیے۔ حالانکہ کام کرنے والوں کے اوقات، سرکاری طور پر تصدیق ہونے کے بعد ڈائنا کی تصویر کے نیچے

لٹکے ہوئے تھے، تاہم اس وقت سعادت شاپ اسسٹنٹس ایکٹ کی بابت غور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"پیسے کو میری زندگی میں دخل ہی نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" سعادت نے پھر سوچا اور اب وہ باسط کی دکان سے باہر اس منی سیاہ سڑک پر دیکھنے لگا جو سیدھی کمیشن کے دفتر تک چلی گئی تھی، جیسے کسی نے پیمانہ رکھ کر اس دکان اور دفتر کے درمیان پون ایک میل لمبا سیدھا خط لگا دیا ہو۔ سعادت نے غنودگی کی سی حالت میں پہلے اپنے سوٹ اور پھر اس سیدھی سڑک کی طرف دیکھا، گویا وہ اتنے اچھے کپڑے پہن کر اس سیدھی سڑک پر چلتا ہوا گیارہ بجے کمیشن کے دفتر میں پہنچ جائے گا، اور ہر مہینے چپکے سے اڑھائی سو روپے جیب میں ڈال لیا کرے گا۔

پھر سعادت کی خود ہی "چپکے سے" کے الفاظ پر اعتراض ہوا۔ شاید اس لیے کہ رول ٹاپ پھر اٹھایا گیا تھا اور ایک خانہ میں مزید روپے ڈالے گئے تھے اور باسط مسکرا رہا تھا اور سعادت بوکھلا رہا تھا۔ سوٹ قریب قریب تیار تھا۔۔۔ سعادت نے اپنی سبز فلیٹ کو ماتھے پر سرکایا اور باسط کی جنونی ہاتھوں کو نوٹ گنتے ہوئے

دیکھا۔۔۔ سعادت نے سوچا۔ "اگر میں ٹیلر ماسٹر ہوتا۔۔۔"

"کھنڈے" ماسٹر باسط نے اپنے ایک شاگرد کو پکارا۔

ایک شاگرد سامنے آیا جس کا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ وہ بہت دُبلا پتلا اور نحیف و نزار تھا۔ اس نے گلوبند کے گرے ہوئے پلّے کو گلے میں ڈالا اور کٹے ہوئے ہونٹ کے احساس کی وجہ سے نیچے کا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کے ساتھ بھینچنے لگا۔ اس نے گلوبند میں تھوڑا سا منھ چھپایا اور بولا۔ "جی! بس تیار ہے۔ اور کھنڈے کے کانوں میں طلائی بیر بلیلاں تھیں۔ وہ مسلمان تھا، لیکن وہ سونے کی ہندوانہ بیر بلیلاں، اس کے کانوں میں ایک ایسے سوال کی صورت لٹک رہی تھیں، جس کا جواب ہندو اور مسلمان لیڈر دینے کے ناقابل تھے۔ "شام کے صاحب" کی طرح اپنے منھ سے نکلتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے کھنڈا بولا۔ "صبح سے انگلیاں سیدھی نہیں ہوئیں۔" اور اس نے انگلیوں کو دبایا اور بولا۔ "پھر بھی آغا صاحب کو ساڑھے دس بجے تک سوٹ پہنادوں گا۔۔۔"

سعادت نے خوشنودی کے اظہار میں سر ہلایا۔

ماسٹر باسط نے رول ٹاپ کے قریب ایک صاف سطح پر فلالین ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے فلالین پر ایک سفید خط ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

سعادت اپنی جگہ اور اس کے ماحول کی منظم سازش سے نکلا۔ آخر اسے اور سوٹ تو سلوانا ہی نہیں تھا، اس لیے وہ وہاں سے اُٹھ کر دکان سے باہر چوبی تختے پر ٹہلنے لگا اور بازار، اور باہر کی غیر منظم چیزوں کو دیکھنے لگا، بے ربط شور سننے لگا۔ دفتر جانے والوں کے ساتھ اب اسکول کی چھوکریاں بھی نکل آئی تھیں اور اپنے سبک پاؤں پر پھسلتی ہوئی کمیشن کے مخالف سمت چلنے لگیں۔ کہیں کہیں ایک دو جوڑے شاپنگ کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ چمڑے اور آئل کلاتھ کی دکان کا نوکر اور ایک کیمسٹ اپنی اپنی دکان کے بورڈ صاف کر رہے تھے۔

باسط کے ہاں دو اور نوجوان داخل ہوئے۔ ایک کا سوٹ سِل چکا تھا اور دوسرا چسٹر کے لیے کپڑا لایا تھا۔ دکان کے اندر ایک درجن مشینوں کی آواز کے ساتھ باسط کہتا ہوا سنائی دیا۔۔۔ دوڑ چودہ۔۔۔ کمر بتیس۔۔۔ چھاتی پونے چھتیس! لیکن یہ چیز بھی سعادت کو متوجہ کرنے کے لیے کافی نہ تھی۔ وہ جمائی لے کر بازار کا غیر منظم اور بے ربط ماحول دیکھنے لگا۔ آخر پھر اسے وہ ربط پسند آیا اور دکان کے

اندر جا کر ڈائنا کے بجائے اس کے کتّے کی طرف دیکھنے لگا۔ آخر انگریزی تہذیب کے مطابق بات کتّے سے شروع ہوتی ہے اور پھر ڈائنا یا ایڈنا تک پہنچتی ہے۔۔۔!

انگریزی کا مقولہ ہے۔ ''مجھ سے محبت کرو، میرے کتّے سے محبت کرو۔'' اور کتا لیلیٰ کے کتّے سے سراسر مختلف ہے۔ کیونکہ ایک وقت میں لیلیٰ کا کتّا ہوتا ہے یا لیلیٰ، دونوں ایک ساتھ نہیں ہوتے۔ سعادت نے پھر سوچا کہ تصویر اس دکان میں کس قدر موزوں ہے۔ لباس کی طرف اتنی توجہ آخر مغربی چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو محبت کی خاطر محبت سکھائی جاتی ہے۔ بیوی سے کہو، تم اچھے کپڑے پہنو تو وہ کہتی ہے ''میں جانتی ہوں۔۔۔ آپ کو مجھ سے محبت تھوڑی ہے۔ محبت میرے کپڑوں سے ہے۔'' انہوں نے مغربی فیشنوں کی تقلید سیکھ لی ہے۔ لیکن ''مجھ سے محبت کرو، میرے کتّے سے محبت کرو'' کا حسین مقولہ نہیں سیکھا۔

اب تک سعادت باسط کا اور بھی قائل ہو چکا تھا۔ لیکن۔۔۔

اس وقت دو لڑکیاں جو ابھی ابھی دکان میں داخل ہوئی تھیں، ایک چھوٹے سے کیس میں شیشے کے سامنے اپنا سراپا دیکھنے لگیں۔ ایک نے کوٹ سلوایا تھا اور دوسری نے شلوار اور قمیص۔ یہ بُت بولتے بھی تھے۔ ان کی وجہ سے کمرے میں

ایک خوشگوار سی گرمی پھیل گئی تھی اور وہ سردی اور بے رونقی جو اس سے پہلے وہاں مسلط ہو چکی تھی دور ہو گئی تھی۔ کھنڈے کا ہاتھ سیدھا ہو گیا تھا اور دوسرے نوجوان کی پتلون کی کریز بہت حد تک درست ہو گئی تھی۔۔۔ اور سعادت کو وہ نوجوان بلانڈ اور برونیٹ کے ساتھ ہوا خوری کر رہے تھے، حرکت کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

اور کیبن کی تصویروں میں کتّا بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا۔۔۔ کتّا۔۔۔ کوٹ، کیونکہ اس سیٹنگ میں مغربی رواج کے مطابق لیلیٰ اور سگِ لیلیٰ۔ "مجھ سے محبت کرو، میرے کتّے سے محبت کرو" کے انداز میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کارنروان کی ڈائنا اس تصویر سے اتر کر کیبن میں چلی آئی ہے اور باسط کارول ٹاپ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا ہے۔

"یہ پھُندنا سا کیا لگا دیا ہے، سوداں۔"

دوسری لڑکی جواب دیتی ہوئی دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ پہلی لڑکی جس کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی کا منہ آئینہ میں نظر آنے لگا اور سعادت ایک جذب کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دوسری لڑکی بولی۔

"ارے رواج ہے۔۔۔پیٹھ پر بھی پھول سا اُبھار دیتے ہیں اور سینے پر بھی۔۔۔"

"مجھے تو تمھارا کپڑا بہت پسند ہے۔

"نراٹاٹ معلوم ہوتا ہے۔۔۔سلا اچھا ہے۔باسط جو ہوا۔۔۔"

دونوں ایک دوسرے کے کپڑے اور سلائی کو بہتر سمجھتی تھیں۔ لڑکی، جس کا نام سوداں۔۔۔ مسعودہ بیگم تھا، اس نے اپنے بال کوئن کرسٹائنا کی طرح بنائے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا چہرہ لمبا کم تھا اور چوڑا زیادہ تھا اور یوں توازن قائم رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے قدرتی بلّور میں سرمے کی ہلکی سی تحریر دکھائی دیتی تھے۔۔۔وہی "مجھ سے محبت کرو، میرے کتے سے محبت کرو" انداز کی۔۔۔ دوسری لڑکی رمز کی طرح کم گو اور تیکھی تھی۔ ٹھوڑی اور منھ کے درمیان ایک پھوڑے کا ہلکا سا داغ تھا۔ لیکن اتنا ہی جتنا زیادہ نہیں ہوتا اور ایک خوبصورت، امتناعی حکم والے چہرے سے کم ہوتا ہے۔ اس کا نام سلطان تھا۔ بہتی ہوئی لکیروں والا کوٹ اس کے جسم کے ابھار پر اُبھرتا اور دباؤ پر دبتا پنڈلیوں کے وسط تک چلا آیا تھا۔ چھاتی پر خوبصورت قوسین بن رہی تھیں۔ سعادت قوسوں کے لیے ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر، چھاتی اور کمر کی قوسوں

کی طرف دیکھنے لگا۔

سعادت سلطان اور سوداں کو دیکھتا رہا، حتیٰ کہ ان لڑکیوں کو اپنی بے پردگی کا احساس ہونے لگا۔ سلطان نے بڑھ کر ہاتھ مارا، اور پلائی ووڈ کے کمرے کا پردہ پیتل کے چھلوں کو پورے پھیلاؤ میں لے کر تن گیا۔ صرف ایک معمولی سی درز باقی رہ گئی۔

اس وقت کھنڈا سعادت کا سوٹ لے کر آیا اور ایک علاحدہ کیبنٹ میں لے جا کر پہنانے لگا۔ سعادت نے فیلٹ کو سیدھا کیا تا کہ وہ ایک شریف انسان نظر آئے اور اس نے جلدی جلدی نیا سوٹ پہنا۔ سوٹ بالکل درست تھا۔ لیکن سعادت نے اس بات کا اعتراض ضروری نہ سمجھا۔ کاروباری طور پر یہ بات درست نہ تھی۔ ”بغلوں کے قریب دبتا ہے۔۔۔“ اس نے کھنڈے کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ دیکھو۔۔۔ فال سیدھی نہیں پڑتی۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ مجھے جلدی ہے۔۔۔“

کھنڈے نے گھٹنوں کے قریب سے قینچی سرکائی۔ انگشتانہ اُتارا اور سوٹ کی جیبوں سے تمام کچے دھاگے نکال دیے۔ اُس وقت لڑکیوں نے کھنڈے کو

اشارے سے بلایا۔ کھنڈا معذرت کیے بغیر ادھر چلا گیا۔۔۔ لیکن سعادت نے احتجاج نہ کیا۔ کھنڈے کی وجہ سے سعادت اور ان لڑکیوں میں ایک رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔ سعادت کے پاس سے ان لڑکیوں کے کیبن تک جانے میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان دو جگہوں کے درمیان ایک غیر مرئی خط لگ گیا ہے۔۔۔۔۔۔ اور یہی خط ہیں، جو راستہ کاٹتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

لڑکیوں کے کیبن میں بے احتیاطی سے داخل ہونے پر پردہ سر گیا۔ اب سلطان کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی۔ وہ پنجابی قمیص پہنے ہوئے تھی اور کمر کے نیچے قوسین بڑی بڑی اور کچھ خوفناک تھیں۔ ان لڑکیوں نے پردے کو اُٹھا رہنے دیا۔ شاید ان کی بے احتیاطی تھی۔ وہ سیدھا تکنا نہ چاہتی تھیں۔ اسی قدر بے حجابی کے ساتھ جیسے سعادت دیکھ رہا تھا۔ لیکن سعادت کیا کر سکتا تھا۔ مرد کا انداز ہی کچھ سیدھا سیدھا، اجڈ اجڈ ہوتا ہے۔ لیکن عورت نگاہیں جھپکا کر ڈالتی ہے۔ جیسے اس کا جسم حسین قوسین کا مجموعہ ہے، ویسے ہی اس کی نگاہیں اور اس کے افعال۔۔۔

سعادت کے جسم میں خون حرکت کرنے لگا۔ اسے اپنے کانوں کے کنارے جلتے

ہوئے محسوس ہونے لگے۔ کھنڈے نے لڑکیوں کے کیبن میں داخل ہوتے ہی سلطان کا کوٹ کھینچا اور پھر اپنے آپ ایک بازو کی دوری پر جا کھڑا ہوا۔۔۔ "یہ کالر کیسے ہے، ذرا ٹھیک کر دو۔۔۔" سلطان بولا۔ کھنڈے نے ہاتھ بڑھا کر کالر ٹھیک کر دیا۔ اور پھر باہر نکلتے ہوئے بولا۔۔۔ "بس بی بی جی۔۔۔ آپ کو کوٹ ایسا پسند آئے گا۔۔۔ جیسے۔۔۔ کبھی پسند نہیں آیا" کھنڈا رُک گیا اور بڑے زور سے دونوں ہونٹ بھینچنے لگا۔ اس وقت لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔

یہ سازش تھی سب سازش تھی۔۔۔ سعادت نے کہہ دیا، صاف کہہ دیا۔ لیکن وہ کوٹ اُتار کر خود کچے دھاگے اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ابھی تک اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ مسعودہ نے بھی کوٹ اُتار دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "باسط صاحب۔"

باسط نے حساب کتاب کا رجسٹر وہیں پھینکا اور کیبن کی طرف آیا۔ ایک لڑکی نے کپڑے کے ایک پلندے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اور بھی کپڑے سلوانا ہیں۔۔۔ لیکن ایک شرط پر آج دوسرے ہفتہ کے روز مل جائیں۔ مسعودہ بیگم کی شادی ہے۔۔۔ مسعودہ شرما گئی اور کہنے لگی۔ "یوں کپڑے مانگ لیتی ایک خاص

تاریخ کو۔۔۔ میری شادی کا ذکر بھی کیا اتنا ضروری ہے کہ دنیا بھر۔۔۔"

"چلو ہٹو۔۔۔ ہٹو۔۔۔" سلطان نے کہا۔

باسط نے مسکرائے بغیر کہا۔ "شنیل ہے۔۔۔ شنیل کے گز لائیں کپڑا آپ؟"

"ایک گز عرض ہے۔۔۔ اور ساڑھے چھ گز ہے۔"

باسط اور کھنڈا دونوں کھڑے تھے۔ کھنڈے نے ایک نظر سے سوداں کے تندرست جسم کی طرف دیکھا، گویا کہہ رہا ہو۔۔۔ "پونے سات گز ہو جاتا تو اچھا تھا۔" لیکن وہ کچھ نہ بولا، شاید کھینچ کھانچ کر گزارا ہو جائے گا۔ مسعودہ کا چہرہ ابھی تک گلابی ہو رہا تھا۔ باسط نے آگے بڑھتے ہوئے سلطان سے کہا۔ "آپ کی قمیص شلوار کا ماپ تو ہے۔۔۔ مگر ان کا۔۔۔۔۔۔

مسعودہ نے کہا۔ "تو ماپ لیجیے۔"

باسط نے کچھ دور جا کر اپنے رول ٹاپ کی چابی گھمائی، اور اسے گچھے سمیت اُچھالتے اُچھالتے ادھر چلا آیا، کمرے کے پاس پہنچتے ہی ماسٹر باسط نے گلے سے فیتہ نکالا اور بولا۔

"آپ ذرا ہاتھ اُٹھا دیں۔"

مسعودہ بیگم نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور سعادت کے گلے میں لعاب خشک ہو گیا۔ مسعودہ سامنے کھڑی تھی۔ ایک خوبصورت عورت۔۔۔ اپنی تمام قوسِ قزح کے ساتھ۔ لیکن ماسٹر نے مسعودہ بیگم کے پیچھے سے فیتہ نکالا اور اس کا دوسرا سرا اس کے ہاتھ میں دے دیا اور سامنے لاتے ہوئے بولا۔ "کھنڈے لکھ لے۔"

"چھاتی اڑتیس۔"

پھر کمر تینتیس۔۔۔۔۔۔ کراس بیک پندرہ، بازو بارہ، کلائی ساڑھے چار اور قمیص کی لمبائی کیا رکھوائیں گی آپ؟۔۔۔ گز سے اوپر۔۔۔؟ رواج نہیں۔۔۔ خیر پسند اپنی اپنی، شنیل اچھی ہے، اچھا انتخاب ہے؟ لیکن اس کے ماپ کی کیا ضرورت ہے؟ اور شلوار۔۔۔ یہ فیتہ رکھیے، ہاں ہاں رکھیے۔۔۔ اور فیتے کو مسعودہ بیگم کے گلابی پاؤں پر چھوڑتے ہوئے باسط اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے فیتے کو گلے میں ڈالا اور چلتا بنا۔

"عجیب ہونّق ہے!" سعادت نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے سوچا۔ "کتنا جذبات سے کورا۔۔۔ غیر شاعرانہ انسان ہے۔ اتنا بھی نہیں کہ ان خوبصورت قوسوں، ان گولائیوں کو دیکھ لے۔۔۔"

اور سعادت مبہوت کھڑا سلطان اور مسعودہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی ہوئی چل دیں۔ سعادت کو کچھ یاد آیا اور اس نے ماسٹر باسط کے رول ٹاپ پر ساٹھ روپے رکھے اور گھبرا کر باہر نکلا۔۔۔ انگلش واچ کمپنی کا کلاک پونے بارہ بجا رہا تھا۔۔۔ اور انٹرویو کا وقت گزر چکا تھا۔

آسنسول ابھی بہت دور تھا۔ یہی کوئی سات ایک میل کے قریب۔

سات میل کا فاصلہ کوئی بڑا فاصلہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس دھان پاتی کے لیے جو پہلے ہی ٹوٹ چکا ہو یہ فاصلہ ایک خاصی منزل کے برابر ہے۔ اپنے من من کے پاؤں سمیٹ کر اوتن اونٹ کے کجاوے کی طرح تاڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ تاڑ اُس علاقے میں بیشمار تھے۔ جدھر دیکھو تاڑ ہی کے درخت نظر آتے تھے اور ان کے مہاسوں سے اپنے آپ جھاگ پھوٹ رہی تھی۔

کچھ دور سڑک کے پاس خاکستری زمین پر کوئلوں کے دھبّے نظر آتے تھے۔ یہ کوئلوں کے گڑھے تھے جو اب بیکار ہو گئے تھے۔ ان گڑھوں کو ملاتی ہوئی سڑک آسن سول کی طرف جا رہی تھی۔ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد اس سڑک پر کوئی گاڑی آکر رکتی اور پھر اُس پاس کے بھوکوں سے بے خبر چل دیتی۔ ''ٹھہرو دادا، رک جاؤ دادا۔۔۔'' اوتن پورے زور سے چلّاتا اور پھر عاجز آکر کجاوے پالان کی طرح دُہرا تہرا ہو کر تاڑ کے نیچے جا پڑتا اور زبان کی نوک سے پسینہ چاٹنے لگتا۔۔۔ دُور۔۔۔ دُور۔۔۔ جہاں زمین آسمان سے کٹتی نظر آتی تھی وہ ایک باڑیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کے ساتھ اُوس کی فصل چھدری چھدری، بوڑھے کے دانتوں کی طرح میلی میلی اُگ رہی تھی۔ فاقوں کے مارے لوگوں نے اُوس کی پیلی پیلی کمزور بالیاں نوچ لی تھیں۔ اب ان میں کچھ بھی نہ تھا بلکہ اس مہا ماری سے بہت پہلے ہمالیہ پھاند کر تینگری نور سے آنے والے جانوروں نے کھپریلوں تک سے دھان ڈھونگ لیا تھا۔

اب دھان پاتی مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں اُبال رہے تھے۔ وہ اور کیا

کرتے؟

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک بھنبھناہٹ سی سنائی دی اور ایک لاری آکر رُکی۔

"رُک جاؤ۔۔۔۔۔۔ رُک جاؤ۔۔۔۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔۔۔۔" اوتن چلّایا۔
"ٹھہرو!"

پھر اوتن نے کالی کا واسطہ دے کر گاڑی کو روکنا چاہا، لیکن ایک دم اس کے دماغ نے فیصلہ کر لیا کہ اب کالی کا واسطہ بیکار ہے، اس مہاماری کے سامنے، کالی اور بھگوان دونوں بے بس ہیں، کالی اور بھگوان ظالم اور مظلوم، دونوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اوتن نے اپنا واسطہ دینا چاہا۔ لیکن اسے کیا غرض تھی۔۔۔۔۔۔

وہ چپ رہا۔

ڈرائیور نے فریاد سن لی۔ اس نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟ آسن سول؟ کیا دو گے آسن سول کا؟"

اوتن نے ایک ہی سانس میں کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے، دے دوں گا۔ تمھارا

غلام رہوں گا ساری عمر۔ ساری عمر تمھارا غلام رہوں گا ساری عمر۔۔۔" اور پھر وہ ہانپنے لگا۔

ڈرائیور تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ موبل آئل گاڑی سے نیچے ٹپک رہا تھا۔ نیچے اُتر کر اُس نے انجن کا ڈھکنا اُٹھایا۔ موبل آئل گیج کو ٹینک میں داخل کیا اور بولا۔ "کافی ہے، کافی۔۔۔" پیچھے سے اس کے ساتھی نے آواز دی۔ "نصیبوں کی جان کو رو رہے ہو دادا؟" ڈرائیور نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں" اور پھر اوتن کی طرف مُڑتے ہوئے کہا۔ "ساری جندگی کی مصیبت کون مول لے۔ نگد کیا دو گے؟ بولو دس روپے دو گے؟"

اوتن نے جلدی سے ہاتھ جیب کے اندر ڈالا اور جیب سمیت نقدی کو باہر لے آیا۔ ایک روپے کا بوسیدہ سا نوٹ تھا اور کچھ سِکّے۔ ڈرائیور بات کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اوتن اپنی جگہ کھڑا کھڑا اچھلا۔ پھر جیسے اسے ہاتھی پاؤں کی بیماری ہو، پاؤں زمین پر گڑے کے گڑے رہ گئے اور ہاتھ آگے بڑھ گئے۔ وہیں کھڑے کھڑے اوتن گر پڑا اور اس کے منھ سے جھاگ پھوٹنے لگی۔

لیکن اوتن اکیلا نہ تھا۔ اس کے پاس ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا۔

یہ سب کچھ اس خواب کی مانند تھا، جس میں ایک آدمی دہشت کے مارے بھاگنا چاہتا ہو، لیکن پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہوں اور بھاگ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہوں۔ البتہ ایسی تفصیلات نظر آ جاتی ہوں، جیسے تاڑ کے پتّے جھوم رہے ہیں اور کوئی آدمی پاس کھڑا۔ لیکن وہ آدمی بولنے لگا، اصل انداز میں، جیسے اصل اور نقل، خواب اور بیداری ایک دوسرے میں گھل مل رہے ہوں۔ یہ خواب نہ تھا۔ کوئلے کے گڑھے پر بیکار چرخی جھکڑے ساتھ برابر چل رہی تھی۔ صاف چکر لگاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ آدمی جو اس بیداری اور خواب کی حدوں کو ملاتا ہوا آرہا تھا، گنگنا رہا تھا۔۔۔ من پگلو ہو گیو رے، تمر و گورنگ روپ دیکھے۔۔۔۔۔۔

اس آخری کشمکش کے بعد اوتن بلبلانے لگا۔ میں مر جاؤں گا دادا۔ گویا زندگی میں اُسے پہلی بار گیان ہوا کہ وہ مر بھی سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل گھڑیوں میں بھی اسے امید رہی کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ وہ نہیں مر سکتا۔ آخر اس نے کسی کا کیا

بگاڑا ہے۔ اب دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں اور اسے یقین ہونے لگا کہ مرنے کے لیے ضروری نہیں کہ کسی کا کچھ بگاڑا جائے۔۔۔ وہ آدمی کھڑا اوتن کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اگرچہ اس کا من گورنگ روپ دیکھے پگلا ہو رہا تھا، تاہم وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھا، وہ آدمی تھا، پتھر تھوڑے تھا۔ یہ بول تو یوں ہی زبان پر چلے آئے تھے، جیسے صبح اُٹھتے ہی کوئی بول بے ساختہ زبان پر آ جائے۔ اچھا یا بُرا۔ آدمی دن بھر کاروبار کرتا ہے اور بنا جانے بوجھے اس بول کو گنگناتا ہے۔۔۔ مثلاً شادی بیاہ کے موقع پر بھی گاتا ہے۔۔۔ ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔

"تمی کتو باڑی چھے؟" اس نے پوچھا۔

اوتن نے پاگل ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "میں مر جاؤں گا، دادا!" اور وہ اور بھی متوحش نظر آنے لگا۔ متر مہاشے نے یہ سوال بھی اسی انداز میں کیا تھا جس میں گورنگ روپ، گنگنایا تھا۔ اب اس نے ایک دم دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "ارے تم مر جاؤ گے تو کیا بگڑ جائے گا۔۔۔ بتاؤ؟

"کیا دنیا کا کاربیوپار بند ہو جائے گا؟"

"تمھارے مر جانے سے لوگ بھی مر جائیں گے؟"

"اس مہاماڑی میں بتیس لاکھ مر گئے۔"

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔۔۔۔۔؟"

اوتن کے ہونٹوں پر جانے مہر لگ گئی۔ کل اس کے سامنے پونم مرا تھا۔ لیکن اس گھڑے پر بیکار چرخی جھکڑ میں ویسے ہی گھومتی رہی۔ گویا اسے بھی رک جانا چاہیے تھا۔ تاڑ ہوا میں اسی طرح جھومتے رہے تھے، اور اپنے مہاسوں سے نشیلی تاڑی کی جھاگ بدستور اگلتے رہے تھے اور پیٹ بھرے آدمیوں کو متوالا کرتے رہے تھے۔ مکھیا ویسے ہی حواصلوں کی طرح نوالے نگلتا رہا تھا۔۔ بچوں کو تکلیف ہوئی۔ اوتن نے سوچا۔ لیکن اس کے مر جانے سے وہ تھوڑے ہی مر جائیں گے۔ زندگی کے ساتھ ٹکر لیں گے تو وہ اور بھی اچھے آدمی بن جائیں گے۔ پدما ان بچوں کے آسرے پر جیتی رہے گی۔ ہو سکتا ہے وہ دوسری شادی کر لے۔ یہ کیسے ہو

سکتا ہے کہ وہ اسی منہ سے دوسرے آدمی کے سامنے انہی الفاظ میں محبت کا اقرار کرے، جن الفاظ میں اس نے اوتن کے سامنے کیا تھا۔۔۔ لیکن اگر ایسا ہو جائے تو آخر کیا ہو جائے گا۔۔۔؟

تھوڑی دیر کے بعد اوتن کو پتہ چلا، اس کا ساتھی سرکاری آدمی ہے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ امید اور خوف کے ساتھ۔ اس آخری زور کو خرچ کر دینے پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گھٹنے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے، جیسے ذبح ہونے سے پہلے مرغ کی چونچ کھل جاتی ہے، اور تنفّس کی تیزی کی وجہ سے اس کی زبان، اس کا گلا، اس کی اوجھڑی تک پھڑ پھڑانے لگتی ہے۔ ایسے ہی اوتن کا منہ کھل گیا تھا اور زبان تالو سے نرخرے تک کانپ رہی تھی۔ آخر وہ سیدھا بیٹھ گیا اور اپنی آنکھوں پر زور ڈالتے ہوئے متر مہاسے کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اُسے کچھ یاد آیا۔ اور بولا۔

”امی براہمن باڑیا آچھے۔“

"اوہ، براہمن باڑیا آچھے۔" متر مہاشے نے کہا۔

کچھ دیر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ اس اثنا میں ایک اور گاڑی آئی اور بھنبھناتی ہوئی گزر گئی۔ اس دفعہ نقّاہت کے باعث اوتن نے اسے کھڑا ہونے کی کوشش نہ کی۔ شاید دوسرے آدمی کو پاس کھڑے دیکھ کر اُسے حوصلہ ہو گیا تھا۔ پھر اسی مبہم سے احساس نے اس کا احاطہ کر لیا تھا کہ وہ مر نہیں سکتا۔ آخر اس نے کون سا قصور کیا ہے؟

جھکڑ کے ساتھ ایک دھول سی چھا گئی۔ تینگری نور سے آئے ہوئے پرندے بڑے بڑے پہاڑی کوّے ہوا کی اوپر کی سطح پر پَر تولنے لگے۔ وہ جس مقام پر اُترنا چاہتے تھے، اس سے گزوں دور جا پڑتے۔ لیکن وہ اپنے حساب سے منزل سے بہت ورے اُترنے کی کوشش کرتے اور ہوا انہیں ڈھکیل کر عین مطلوبہ جگہ پر بٹھا دیتی۔ اوتن اور متر مہاشے میں کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اوتن کی جان میں جان سی آ گئی تھی۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی سے دھول جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا، دادا۔ امن کی فصل لینے کے لیے ہم نے اپنا

سب کچھ بیچ دیا۔ لیکن وہ فصل بھی کنگلوں نے لوٹ لی۔ اوس بونے کی ہمّت کس میں تھی۔"

متر مہاشے نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تعجّب ہے، آسن سول کے لوگ بھی بھوکوں مریں۔"

"کیوں؟ آسن سول میں کیا ہے؟"

"آسن سول میں کیا ہے؟ سارا بنگال بھوکوں مر گیا، لیکن سرکار کو جنگ کے لیے یہاں سے کوئلہ لینا تھا۔ وہ آسن سول کے مزدوروں کو کیسے مار سکتی تھی؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اوتن نے کہا۔ "لیکن اس علاقے میں جو سفید پوش لوگوں کا حال ہوا وہ تم نہیں جانتے۔ مانگنا وہ عار سمجھتے تھے اور دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ کان کے مالکوں تک کو کچھ نہ ملتا تھا۔ وہ مزدوروں سے چھین جھپٹ کر کھاتے تھے۔۔۔" یہاں اوتن سانس لینے کی غرض سے رکا۔

"یہ چھینا جھپٹی وہ ہمیشہ کر سکتے تھے۔" متر مہاشے نے اوتن کو کم بات کرنے کا

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں متر مہاشے۔۔۔" اوتن نے رُکتے ہوئے کہا۔ "انہیں اتنا کم ملنے لگا کہ مشکل سے ان کا پیٹ بھرتا تھا۔ ہم سب کچھ چور بازار سے پیسے کے زور خریدتے، لیکن اب اس ایماندار سرکار نے نیچے سے چور بازار بھی ختم کر دیا۔۔۔ چور بازاری بری چیز ہے نا!"

اور پھر جانے اوتن کو شک سا گزرا۔ غصّہ بھی نشے سے کم نہیں۔ پھر اوتن میں طاقت عود کر آئی۔

"تم چور بازار بند کرنے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "تم چور بازار بند کرنے آئے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ یہاں سب لوگ بھوکوں مر جائیں گے۔۔۔ سب۔۔۔ مزدور۔۔۔ مزدوروں کے مالک۔۔۔ سب۔"

"میں چور بازار بند کرنے نہیں آیا۔"

"تو پھر تم چور بازار میں نفع کمانے آئے ہو؟" اوتن نے اور غصّہ ہوتے ہوئے کہا

لیکن اس کے منہ پر کف سی آ گئی۔ اوتن نے متر مہاشے کا چہرہ ٹٹولنے کی غرض سے ہاتھ بڑھایا، لیکن اس کے ہاتھ پاؤں نے اسے ہلنے نہ دیا۔ ایک پسپائیت اس پر چھا گئی اور اس نے کہا۔ ”ہماری جان بچانا تمھارا فرض ہے۔۔۔ تم سرکاری آدمی ہو۔۔۔“

متر مہاشے بتر بتر اوتن کی طرف دیکھتے رہے۔

اوتن بولا۔ ”تم مجھے آسن سول بھجوا سکتے ہو۔ ضرور بھجوا سکتے ہو۔۔۔ مرنے سے پہلے۔۔۔“

متر مہاشے نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں لوگوں کی جان بچانے نہیں آیا۔“

”نہیں؟“ اوتن نے پھر گھٹنے سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کرنے آئے ہو؟“

”مجھے مرنے والوں کی تعداد گننے پر لگایا گیا ہے۔“

اوتن نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں سے دیکھا۔ متر مہاشے آنکھوں سے

نمی پونچھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا متر مہاشے کسی اچھے خاندان کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے خاندان کے آدمی، جسے اس مہاماری میں بھوک کے لیے جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ جس کی بہنوں کو دبے پاؤں اپنے ہاں کے چور دروازے سے رات کے وقت جانا اور آنا نہیں پڑا۔ وہ رحم دل تھے۔ ان کی آنکھیں نمناک تھیں۔۔۔ لیکن اوتن نے سوچا۔ ان کے رحم دل ہونے کا اسے کیا فائدہ؟ اس قسم کا ترحم بھی عیاشی تھی۔

تاڑ کے اوپر سے بتاشوں کی طرح کے جھاگ کے قطرے گرے۔ سائیں سائیں کی آواز میں اوتن کی آواز گم ہو گئی، وہ پھر بلبلانا چاہتا تھا، اور متر مہاشے کو کہنا چاہتا تھا۔۔۔ پھر یہاں کیوں کھڑے ہو۔۔۔ جاؤ۔ اپنے کاغذوں میں ایک اور نام لکھ لو۔ متر مہاشے دیکھنے میں آنسو بہا رہے تھے۔ جیسے کوئی گدھ ہو اور کسی جانور کے مر جانے کا انتظار کر رہا ہو۔ اگر وہ چلے جاتے تو خانہ پری کے لیے پھر انہیں لوٹنا پڑتا۔

متر مہاشے نے اوتن کے کندھے چھوئے اور کہا۔

"اوتن دادا۔۔۔ تم لوگ خود کچھ بھی تو نہیں کرتے۔ ہر کوئی اپنی مدد آپ کرے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔

اوتن نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔ متر مہاشے بولے۔

"اوتن دادا، تم کلکتے کیوں نہیں چلے جاتے۔۔۔ کلکتے۔"

اوتن پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اس کے اوجھڑی پھڑک پھڑک کر ہار چکی تھی اور اس کا دماغ ایک جالا سا بننے لگا تھا۔ اس کے ذہن کے افق پر ایک دھول سی چھا گئی۔ پھر کچھ ہوش آئی۔ اب کے متر مہاشے خواب کے عالم میں تھے۔۔۔ اوتن کسی زمانے میں خود متر مہاشے تھا۔

اوتن کے بزرگ براہمن باڑیا کے گاؤں اوبی میں رہتے تھے۔ اوتن کا باپ ایک معمولی حیثیت سے ریلوے ورکشاپ میں نوکر ہوا تھا۔ وہ صرف بجلی کے پنکھوں پر آرمیچر بُنا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پنکھے صرف رؤسا کے ہاں ہوتے تھے۔ اس لیے ایک پنکھا معمولی سا خراب ہو جانے پر جیتندر ناتھ، اوتن کے باپ کی رسائی

گورنر تک ہو جاتی تھی۔

جو تن بابو ورکشاپ سے اکثر تاریں، سوِچ، گاڑیوں کا روغن اور ایسی کئی ایک چھوٹی موٹی چیزیں اُڑا لیا کرتے تھے۔ ایندھن کی ان کے ہاں ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی، کیونکہ تیل میں بسے ہوئے چیتھڑے، جن سے انجن صاف کیے جاتے تھے، بکثرت مل جاتے تھے۔ بیٹری کے ذریعے ان کے ہاں بتّیاں جلتیں۔ اور یہ بات آس پاس کے دس بیس گاؤں کے لیے عجوبہ تھی۔ اس کے باوجود اکثر طالب علموں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بیرے کی حیثیت سے صاحب کے ہاں نوکر ہو جائیں اور جان بوجھ کر انگریزی کا کوئی لفظ نہ بولیں، اور پھر میم صاحب یا صاحب کو کہیں کہ انہیں انگریزی پڑھا دے۔ پھر ایک دن میں انگریزی کی پرائمری اس حد تک پڑھ جائیں کہ صاحب ان کی ”خداداد لیاقت“ کا قائل ہو جائے اور فوراً کہے، تم پلیٹیں دھونا چھوڑ دو۔۔۔ تم ناحق رکابیاں چمکاتے ہو۔ حالانکہ تم ہندستان کی قسمت چمکا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ اور پھر صاحب فرلو پر ولایت جائیں تو انہیں بھی ساتھ لے جائیں۔ اور انہیں آکسفورڈ میں داخل کرا دیں۔۔۔

اپنے خرچ پر۔۔۔ صاحب جو ہوئے اور ہر صاحب فراخ دل ہوتا ہے۔۔۔ پھر آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کر کے لوٹیں تو قریب قریب وہی مرتبہ حاصل کر لیں، جو ان کے صاحب کو حاصل تھا۔ وہ لوگوں کو حیران کر دیں اور پھر ان تمام بھائیوں سے بدلہ میں، جن کے ساتھ تین پشت سے مقدمہ چل رہا تھا، یا جنہوں نے نوکری کے سلسلے میں ان سے بات تک کرنا گوارانہ کیا تھا۔

کرسمس کے دنوں میں اپنے ہاں ڈالی لے جانے اور

May God bless you! May God shower good luck on ----- may God-you and your near and dear ones

ایسے الفاظ کہنے والوں کو صاحب لوگوں نے ابھی نفرت کرنا شروع ہی کیا تھا۔ بظاہر خوش ہوتے تھے، لیکن جوں ہی خوشامدی لوگ کوٹھی کے احاطے سے باہر نکلتے، صاحب لوگ، میم لوگ اور باوا لوگ ہنستے اور نفرت سے "Bloody swines these" اس قسم کے خطابات سے ان لوگوں کو یاد کرتے۔ لیکن

ایک اور طریقہ بھی تھا، جسے جوتن بابو نے کامیابی کے ساتھ اختیار کیا۔ اس نے گورنر کی بیوی کے ہاں تھیلی دار گھنٹی لگا دی۔ گورنر صاحب بہادر کے سلام بولنے پر ہز ایکسیلینسی جاگ بھی پڑتیں اور ان کے اعصاب پر گھنٹی کی کرخت آواز سے کوئی بُرا اثر بھی نہ پڑتا۔ ہز ایکسیلینسی نے فوراً کہا۔ ''مانگ کیا مانگتا ہے۔'' جوتن نے کہا۔ ''میم صاحب، آپ کا دیا بہت کچھ ہے۔ آپ کے جوتوں کے صدقے سب کچھ حاصل ہے۔ جب میم صاحب نے تیسری مرتبہ کہا تو جوتن بولا۔ ''یور ایکسیلینسی! میرا عہدہ بڑھا دیا جائے۔'' اسی دن ملٹری سیکرٹری کے نام چٹھی لکھی گئی۔ ملٹری سیکرٹری نے ایجنٹ صاحب کے نام لکھا۔ اور جوتن بابو شدہ شدہ جرنی مین کے عہدہ تک جا پہنچے وہ فورمین بھی ہو سکتے تھے بشرطیکہ وہ عہدہ انگریز کے لیے وقف نہ ہوتا۔

تو گھر بھر میں اس قدر فراغت تھی۔ اوتن ابھی اسکول سے نکلے ہی تھے۔ صحت بنانے کا انہیں خوب خیال تھا۔ آخر تمام زندگی یہی صحت خرچ کرنا تھی۔ وہ دن رات ڈنٹر پیلا کرتے، مالش کرتے۔ پہلے تو وہ صبح دہی کا بھرا ہوا ایک کٹورا پی

جاتے۔ پھر سورج نکلتے سمے پچاس بادام الائچی کے ساتھ کوٹ کر لڈو سا بنا لیتے اور کھا جاتے۔ پھر میاں شمس الدّین کے ہاں کا سا بونٹ پلاؤ اور مُرغّن چیزیں کھائی جاتیں۔ پھر دودھ پیا جاتا۔ پیٹ پر اتنا بوجھ ہونے سے رات کو اکثر سوپن دوش ہو جاتا۔ اور اس کمزوری کو پورا کرنے کے لیے اگلے روز اور کھایا جاتا۔۔۔

جسم میں قوّت وافر تھی۔ جذبات کا خزینہ بھی بہت تھا۔ معمولی سی بات پر آنسو اُمڈ آتے تھے۔ چونکہ طاقت ور آدمی ہر کسی کو معاف کر دیا کرتا ہے، اس لیے اوتن کسی کو کچھ نہ کہتا۔ ہر ایک کو معاف کر دیتا اور معاف کر دینے کے بعد وہ سوچتا۔ خدایا میں تیرا کتنا عاجز بندہ ہوں اور پھر آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگتے۔ اسے اکثر خیال آتا، اگر میں چاہتا تو ایک پل میں اس شخص کا کچومر نکال سکتا تھا، لیکن میں نے اسے مارا نہیں۔۔۔ اس کی بیوی ہے جو ہمیشہ بیمار رہتی ہے اور پھر یہ اناتھ آلیہ کا منتری ہے اور ہر سال اس کے ہاں ایک بچّہ پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔ اور پھر آنسو۔۔۔

چنانچہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سانیالوں کے مزارع نرپیندر کی بیوی منیکا بیمار

پڑی تھی۔ اس کا خاوند، بوڑھے والدین، نصف درجن بچوں اور وقت بے وقت کی نوکری کے درمیان کس قدر پریشان پھرتا تھا۔ اوتن اکثر اس کے ساتھ ہسپتال جایا کرتا تھا۔ اسے تمام مریضوں کی حالت پر رحم آتا۔۔۔ وہ لوگ چاہتے تو تندرست ہو سکتے تھے۔ وہ ہوا خوری کرتے، پھل کھاتے تو چند دنوں میں راضی ہو جاتے۔۔۔ ایک دن اوتن ایف وارڈ میں، جہاں اسٹیشن ماسٹر گروپ کے لوگ اور ان کے وابستگان بیمار پڑے تھے منیکا کے پاس پہنچا۔ منیکا کو کثیر الاولادی سے دق ہو چکی تھی۔

"میں تمھیں علاج بتاؤں دیدی۔۔۔؟" اوتن نے آناً فاناً سوال کیا۔

"ہاں اوتن بھیّا۔۔۔ اگر تم مجھے صحت دے سکو تو میں آرام سے بچّے پال سکوں۔۔۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔"

اس وقت نرپیندر آ گیا۔ وہ دفتر سے چھٹی لے کر آیا تھا۔ چونکہ ہر روز اسے اپنی بیمار بیوی کے لیے ڈبّہ پہنچانا پڑتا تھا، اس لیے دفتر سے دیر ہو جایا کرتی تھی، اور

اس کے آفیسر دھمکی دیتے تھے۔ نرپیندر اپنے اسٹیشن کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں لگے بندھے آمدنی ہو جاتی تھی۔ ورنہ اتنے بچوں کا پیٹ کہاں سے پل سکتا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا، پیسے بھی آتے رہیں اور منیکا بھی بچ جائے۔ البتہ اسے منیکا کی زیادہ پروا تھی اور وہ بچوں کو نہیں چاہتا تھا، جو بن بلائے مہمان کی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے۔ نرپیندر کو سامنے دیکھ کر اوتن جھینپ گیا۔ لیکن اوتن کی نیّت صاف تھی۔ اس لیے وہ بہت جلد سنبھل گیا۔ منیکا کے دُبلے پتلے نحیف وزار مالک نے بھی ایک تیکھی نظر سے اوتن کی طرف دیکھا، کیونکہ وہ اس کی غیر حاضری میں بھی ہسپتال پہنچنے لگا تھا۔ نرپیندر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نیّت بھی صاف تھی۔

اوتن نے کہا۔ ''منیکا میری بہن ہے۔''

منیکا کے خاوند نے کہا۔ ''وہ میری بیوی ہے اور وہ دق سے مری جا رہی ہے؟''

''اس کی علاج تو بتانے آیا ہوں دادا۔۔۔ سنو گے؟''

"کہو کیا دارو بتاتے ہو؟"

"دیکھو پیٹ بیماری کا مرکز ہے۔ ہر بیماری پیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر تمھارا پیٹ صحیح کام کرنے لگے، تو تمھارا دل و دماغ اور اعضائے رئیسہ ٹھیک کام کرنے لگیں گے، پھر تم کبھی بوڑھے نہ ہو گے، کبھی بیمار نہ ہو گے۔ ہم نے پیٹ کو مصنوعی قسم کی گرمی سے تباہ اور برباد کر رکھا ہے۔ ہم چائے پیتے ہیں انگریزوں کی نقل میں، لیکن تم نہیں جانتے چائے کتنا نقصان کرتی ہے اور انگریز چائے کے ساتھ کتنا مکھن کھاتے ہیں۔ چائے پیٹ میں انتڑیوں کے اندر ایک چکنی اور غلیظ سی تہ جما دیتی ہے جو کبھی دور نہیں ہوتی۔ سو اگر چائے پینا اتنا ہی ضروری ہے، تو مکھّن کھایا کرو۔

"تم لوگوں کے پیٹ جلے ہوئے ہیں۔ میں انہیں ہرا کر سکتا ہوں۔ مثلاً اگر تم مٹی کو اپنے پیٹ پر باندھنے لگو، صاف اور شدھ مٹی کو تو مٹی مساموں کے راستے سے تمھارے پیٹ کی تمام غلاظت کو کھینچ لے گی۔ مٹی میں صاف اور شدھ کرنے کی بہت طاقت ہے۔ تم سیمنٹ پر غلاظت پھینکو فوراً بدبُو پھیل جائے گی۔ خدا کی

زمین کروڑوں انسانوں کی غلاظت سے ہر روز خراب ہوتی ہے، لیکن اس میں سے بدبُو نہیں آتی اور پھر مٹی پر کون سے دام لگتے ہیں۔ خدا کی سب بڑی بڑی نعمتیں تمھیں مفت ملتی ہیں۔ لیکن چونکہ انسان دام خرچ کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اسے یقین ہی نہیں کہ مفت بھی آرام ہو سکتا ہے۔۔۔ ہر روز آسمان پر ستارے نمودار ہوتے ہیں، اور چاند اپنی کرنوں سے ساری دنیا کو منور کرتا ہے۔ کوئی چاہے تو انہیں پہروں دیکھتا رہے۔۔۔ مفت۔۔۔ بالکل مفت۔۔۔ برخلاف اس کے کوئی مصوّر ان کی نقل اتارے تو اسے ایک نظر دکھانے کے لیے دام وصول کرلیتا ہے۔۔۔ روشنی۔۔۔ پانی۔۔۔ ہوا۔۔۔ قدرت کی سب نعمتیں مفت ملتی ہیں۔ اتنی کثرت سے، اتنی بہتات سے۔۔۔

پھر اوتن نے ہاتھ لگائے بغیر لکڑی کی قمچیوں کی مدد سے پٹ سے ایک پٹ سن کے ایک کپڑے پر مٹّی کی تہیں جما کر دیکھیں۔

پٹاں بنا چکنے کے بعد اوتن کہنے لگا۔ ”تمھیں مٹّی اوبی گاؤں سے نہیں لینا ہو گی۔ مٹی چکنی ہو۔ گنگا کے کنارے کی ہو تو بہتر ہے۔ سب سے اچھی مٹّی گنگا کے

کنارے ملتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے ارد گرد کی مٹّی غلاظت سے پٹی پڑی ہے اور بہت ریت ہونے کے باعث مفید نہیں ہو سکتی۔"

منیکا کے خاوند نے کہا۔ "جو گنگا کے کنارے مٹی لینے جائیں تو۔۔۔"

اوتن نے سنی اَن سنی ایک کرتے ہوئے کہا۔ "تو یہیں کسی صاف جگہ سے مٹی لے لی جائے۔"

"پٹیوں کے بعد دوسرا علاج سنٹر باتھ ہے۔" اوتن کہا۔ "آؤ میں تمھیں سنٹر باتھ کا طریقہ بتاؤں۔ منیکا میری بہن ہے۔ آخر اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔" پھر وہ جھجک کر بولا۔ "منیکا کپڑے اُتار کر پانی میں بیٹھ جائے۔ پانی ہمیشہ ٹھنڈا ہو تو اچھا ہے۔ ہمارے میدانوں کے دریا تو یہاں تک پہنچتے پہنچے گرم اور گندے ہو جاتے ہیں۔۔۔"

"دیکھو یوں بیٹھ جاؤ۔۔۔ یوں۔۔۔ ہاں! سب جگہ پانی میں ڈوبی رہے۔ پھر بائیں ہاتھ سے دونوں جگھوں کے درمیان پانی لو، ارے اس میں شرم کی کون سی بات

ہے۔ یہاں اعصاب کی گانٹھ ہوتی ہے۔ یہاں سے مصنوعی، غیر قدرتی گرمی نکل جانی چاہیے۔ ہم نے ان جگہوں کو غیر قدرتی اور کثرت استعمال سے بیماری کا مسکن بنادیا ہے۔۔۔ پھر شرم۔۔۔!"

منیکا نے اپنا منھ شرم سے تکیے میں چھپالیا۔

اوتن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب جھوٹی شرم ہے دیدی! اور پھر اوتن نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا تو ارادہ ہے کہ ایک ایسی بستی بساؤں جس میں سب لوگ ننگے رہیں۔ آج ہم نے خدا کے دیے ہوئے خوبصورت جسم کو طرح طرح کے روگ لگا رکھے ہیں۔ آج کون آدمی ہے اور کون عورت ہے جو کسی کے سامنے ننگی کھڑی ہو سکتی ہے۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس قسم کا خوبصورت جسم اُسے خدا نے دیا تھا، اُسے اُس نے برقرار رکھا ہے۔۔۔"

"بھیّا! کپڑے پہننے میں مساوات کہاں؟ ننگے پن میں مساوات ہے۔ سب لوگ،

بہن بھائیوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں!" اور پھر اوتن نے سر جھکا دیا، اور بولا "بلکہ یہ کہ ناگوں کی اس بستی میں جب کوئی نیا آدمی آئے تو اس کے اعزاز میں محبت اور اخوت کا ایک گیت گایا جائے تاکہ آنے والے کو پتہ چلے کہ وہ چیرنے پھاڑنے والے جلّادوں اور نرسوں کے پاس نہیں جا رہا ہے، بلکہ ایسے لوگوں میں جا رہا ہے جو اسے بہن بھائی سمجھتے ہیں۔۔۔ صرف محبت سے انسان کی بیماریاں دور ہو سکتی ہیں۔"

منیکا کے خاوند نے ایک اور کڑی نگاہ اوتن پر ڈالی۔

محبت اور جوش کے ساتھ اوتن کا گلا بھر آیا۔ ایک مصمّم ارادے کے ساتھ اس نے گلا صاف کیا اور بولا۔ "ننگا رہنے سے خواہشات کم ہو جاتی ہیں، بلکہ حکما کا خیال ہے کہ عورت اور مرد کی ایک دوسرے کے لیے کشش ہی نہیں رہتی۔ اگر رہے گی تو اتنی، جتنی قدرتی طور پر ہونی چاہیے۔ اس وقت سب کچھ غیر قدرتی ہے، مصنوعی۔۔۔ ہمارا رہنا سہنا، کھانا پینا، پہننا، بچّے پیدا کرنا۔۔۔ ہمارے علاج کے سب طریقے مصنوعی اور غیر قدرتی ہیں۔"

پھر اسی طرح اوتن سنٹر باتھ کے متعلق ہدایات دینے لگا۔ ”کسی قسم کا بیمار میرے پاس آئے، تو وہ چند دنوں میں تندرست ہو جائے گا۔ پیٹ ٹھیک ہو جائے تو پھیپھڑے اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔ تم منیکا کو میرے پاس لاؤ۔ سنٹر باتھ میں اپنے ہاتھ سے نہیں دوں گا۔ یہ کام تمھارا ہے۔ تم اس کے خاوند ہو۔ سچ پوچھو تو میں اپنے ہاتھ سے علاج کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا، بشر طیکہ۔۔۔ سب عورتیں میری بہنیں ہیں۔

ہو سکتا ہے میں ہندستان میں ننگے لوگوں کی بستی قائم کروں، تو پہلے پہل مردوں اور عورتوں کو مصلحت کی بنا پر ایک دوسرے سے علاحدہ رکھوں۔ ممکن ہے عورت اور مرد لنگوٹ باندھے رہیں اور پھر ایک سماں آئے کہ وہ کپڑے اُتار کر کھڑے ہو جائیں۔ ننگے۔۔۔ ایسے ننگے جیسے وہ خدا کے پاس سے آئے تھے۔

اس قسم کی بستی پہاڑ کے دامن میں ہونی چاہیے۔ ایسی جگہ پر جہاں نہ پہاڑ ہو اور نہ بالکل میدان۔ نہ بہت سردی ہو اور نہ بہت گرمی۔ وہاں پھل پھول کثرت سے اُگائے جائیں۔ وہاں انسان صرف پلنے کے لیے جائے۔ گھناؤنی سے گھناؤنی بیماری

کے مریض کو پہاڑ پر بھیج دیا جائے تاکہ وہ چشموں پر نہائے، پھل کھائے، چٹّان پر بیٹھ کر دھوپ تاپے، ہنسے اور کھیلے۔۔۔ اور پھر جب تندرست ہو جائے تو لوٹ آئے۔"

اس آخری فقرے پر نرپیندر ناتھ کو بہت غصّہ آیا۔ منیکا لوٹ نہ آئے گی تو آخر کہاں چلی جائے گی۔ منیکا کا تصوّر چمک اُٹھا تھا۔ اسے اپنے صحن میں بچے ہنستے کھیلتے، کودتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور وہ۔۔۔۔۔۔ ان کی مغرور ماں، ان کے درمیان بیٹھی فرحت کے احساس سے کُک کُک کر رہی تھی۔ منیکا نے نرپیندر کو روکا بھی، لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے اوتن کو خوب گالیاں دیں۔

"کیا بک رہا ہے۔۔۔ فلاں فلاں کے جنے۔۔۔"

پھر وہ بولا۔ "پھل تیری ماں کے پاس سے آئے گا اور پہاڑ پر تیرا باپ لے جائے گا۔ بچے تیرے کون ہوتے سنبھالیں گے اور دادی ماں۔۔۔؟ نوکری میں پہلے ہی ایک چوتھائی تنخواہ پر چھٹی لے چکا ہوں۔ چھٹی کے نئے قوانین کے مطابق اوّل تو

چھٹی ملے گی نہیں اور جو مل بھی گئی تو بغیر تنخواہ کے۔۔۔ نوکری کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اور پنشن میں فرق پڑے گا۔۔۔ اڈے پر نہ رہیں گے تو کل ہی کیرتی، زمین کی دوسری مینڈھ پر بھی اپنا ہل چلا دیں گے۔۔۔"

ایک لمحے کے لیے اوتن کو غصّہ آیا، لیکن وہ غصّہ اپنے آپ اتر گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہ ان لوگوں کو زندہ رہنے کا راستہ بتا رہا تھا اور وہ اُسے گالیاں دے رہے تھے۔ وہ ان لوگوں پر اپنا آپ قربان کر رہا تھا۔ مخلوق کے لیے اس کے دل میں کتنا درد تھا۔۔۔ اوتن کا منھ سرخ ہو گیا۔۔۔ اوتن نے منیکا اور نرپیندر کو معاف کر دیا۔

لیکن اس کے معاف کر دینے سے کیا ہوتا تھا۔ منیکا اس کی باتیں سن کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بچ جانے کے خیال نے اس کے دل میں طاقت پیدا کر دی تھی کہ وہ اپنے سوجے ہوئے پاؤں کے باوجود چلنے لگی۔ لیکن جب نرپیندر نے اسے اپنی مجبوریوں کا احساس دلایا تو وہ ایک دم بیٹھ گئی۔۔۔ کچھ دیر بعد اس پر بحران طاری ہو گیا۔۔۔ پھر ماں کا غرور اور تکبّر ہمیشہ کے لیے خاک میں مل گیا۔۔۔ اور اسی

غنودگی کے عالم میں دوسرا واقعہ جو اوتن کو یاد آیا وہ ستیندر سانیال کے ہاں کی آگ تھی۔ سانیال جو آبائی درباری تھا کسی زمانے میں خاصے امیر تھے، لیکن چند قانونوں کی زد میں آکر مفلس اور قلاش ہو گئے۔

اوبی باڑیا میں، یا اوتن کا گھر اچھا گنا جاتا تھا یا سانیال کا۔ لیکن جب سے ستیندر کے چھوٹے بھائی راہو نے پہلے پہل ہوٹل کھولا اور بعد میں چینی کے برتن بنانے کا کارخانہ بنایا تب سے وہ مکان بھی رہن رکھ دیا گیا۔ یہی بہت تھا کہ جس شخص کے پاس مکان رہن رکھا گیا اس نے انہیں وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ جس آدمی کا دماغ ساہوکاری سے ہوٹل تک پہنچتا ہے اور جسے ہوٹل اور بھٹے کے درمیان اور کوئی کاروبار نظر نہیں آتا، وہ کیا کام کرے گا۔۔۔۔۔

جیسے عام طور پر ہوتا ہے۔۔۔ بھئی فلاں کاروبار شروع کر دو۔ ہاں بھئی شروع کر دو۔ اور یہ کوئی جانتا پوچھتا نہیں کہ جو آدمی کاروبار کرتا ہے، وہ اس کام کی استعداد بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ہوٹل کنفیکشنری کے آسرے پر چلتا تھا۔ تمام ٹافیاں، کینڈی اور پیسٹری بیرے لے گئے۔ گاہکوں میں سے جو بیروں کو

زیادہ ٹپ کرتے تھے، بیرے انہیں اور چیزیں اُٹھا کر سستے داموں میں دے دیتے۔ اسی طرح چینی کے برتنوں کا پورا بھٹہ ناہموار آنچ کی وجہ سے خراب ہو گیا۔

ایک دن اوتن اپنے ہاں بیٹھا نارنگی میں لوکاٹ کا پیوند لگا رہا تھا، کہ کوئی دوڑا دوڑا آیا۔۔۔ "آگ لگ گئی۔۔۔ آگ!"

"کہاں؟" اوتن نے اپنا کام چھوڑتے ہوئے کہا۔ "کہاں آگ لگ گئی۔۔۔؟"

اوتن نے غور سے دیکھا۔ وہی راہو تھا جو دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اس نے کہا۔۔۔

"ہمارے ہاں، اوتن دادا۔۔۔ ہم کہیں کے نہ رہے۔"

اوتن نے سانیالوں کے گھر کی طرف دیکھا۔ اس دن ہوا کا رُخ پچھم کی طرف تھا۔ سانیالوں کے مکان سے لے کر دور پچھم تک دھوئیں کے پرّے تیرتے نظر آتے تھے۔ اگرچہ اوبی باڑیا میں اوتن کے مکان اور سانیال کے مکان کے

درمیان دو تین ٹیلے تھے، لیکن آگ کا تیج وہیں سے محسوس ہو رہا تھا۔ دھوئیں کے ساتھ ایک ہلکی سی سُرخی بھی آسمان پر نظر آ رہی تھی۔ چونکہ ابھی دن تھا، اس لیے وہ سرخی اتنی تیکھی دکھائی نہ دیتی تھی۔

اوتن دونوں ٹیلے پھاند کر اوبی باڑیا کے دونوں طرف سانیال کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آگ کے شعلے بڑی بڑی اور خون آلودہ زبانوں کی طرح لپک رہے تھے۔ خونخوار جانور کی طرح اس آگ نے اپنے شکاروں کو دہشت زدہ کر رکھا تھا، اور وہ مکان میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ شعلوں کے پیچھے گھر کی نوجوان لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کے اُڑتے ہوئے بال شہابی ہو رہے تھے۔۔۔

پائیں تالاب میں پانی کم تھا۔ شکایت یہ تھی کہ پانی کم آتا تھا اور کیچڑ زیادہ لیکن آگ بجھانے کے لیے کیچڑ بھی غنیمت تھی۔ اوتن نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اس وقت سورج پچھم میں آدھا کٹ چکا تھا، اس لیے پورب کی طرف سے گویا اُمڈے ہوئے اندھیرے کے ساتھ آگ کی روشنی مل کر ارغوانی ہو رہی تھی۔ ارد گرد

کھڑے لوگوں کے چہرے تمتمارہے تھے۔

لوگ باہر سے پانی، کیچڑ، دھول پھینکتے تھے، لیکن کسی کو اندر جانے کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ آگ لگ گئی۔۔۔۔۔۔ آگ آگ۔۔۔ آگ۔۔۔

دور سے آواز آئی۔ معلوم ہوتا ہے۔ آگ لگ گئی ہے۔

اتنے کریہناک منظر کے باوجود ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"آگ۔۔۔ آگ۔۔۔ اور باہر کھڑے لوگ آگ میں گھرے ہوئے لوگوں کی سراسیمگی میں اضافہ کرنے لگے۔ چاروں طرف سے چیخ و پکار ہونے لگی۔ بچے اور عورتیں اور کچھ مرد بدستور مکان کے اندر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔

اوتن بدستور باہر کھڑا ان سراسیمہ لوگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ترحم سے اس کا جی بھر آیا۔ اس وقت آگ کے اندر کودتا تو وہ خود جل جاتا۔۔۔۔۔۔ وہ باہر کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ آگ کھڑکیوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے شعلوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگوں کی طرف حیرت سے دیکھا۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔

”یہ لوگ بھاگ کیوں نہیں جاتے؟“

اوتن نے پھر کجاوے کی صورت میں اپنا تن بدن سکیڑ لیا اور خالی خولی نگاہوں سے تاڑ کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ہوا کے تیز ہونے سے دھول سی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ متر مہاشے کی شکل دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگی۔ اتنے میں ایک لاری آئی اور ہارن بجاتی ہوئی گریبوں کے پاس سے گزر گئی۔ اوتن کی ہمّت جواب دے چکی تھی، جب کہ متر مہاشے نے اپنا سوال دُہرایا۔

”تم کلکتے کیوں نہیں چلے جاتے؟“

اوتن کے ہونٹوں پر غصّے اور کف کی ایک ہلکی سی تحریر دکھائی دی۔ وہ کچھ نہ بول سکا۔ کچھ دیر بعد اس کا کجاوہ اپنے آپ سیدھا ہونے لگا۔

متر مہاشے اس کا مطلب نہ سمجھا۔ اس نے سوچا، شاید اوتن آرام کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی سلک کی چادر کا ایک پلّو اُٹھایا۔ اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور۔۔۔ ”من پگلو ہو گیو رے“ گنگناتا ہوا سامنے نظر آنے والی باڑی کی طرف چل دیا۔